حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ

سب رس

ISSN-2278-6902

دسمبر 2017ء

-/30روپے

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

جناب محمد محمود علی عزت مآب نائب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ چومحلہ پیالس خلوت مبارک حیدرآباد میں منعقدہ تقریب بسلسلۂ بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈ/بیسٹ اردو اسٹوڈنٹ ایوارڈ سے خطاب کرتے ہوئے۔
تصویر میں جناب اے کے خان مشیر اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ، جناب سید عمر جلیل سکریٹری محکمہ اقلیتی بہبود اور پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی دیکھے جاسکتے ہیں

محفل نساء بنگلور کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار "عصری اردو ادب میں مابعد جدیت: ۱۹۸۵ء تا حال" کے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر بیگ احساس کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے۔ جناب ماہر منصور، جناب خلیل مامون (صدر اجلاس)،
ڈاکٹر شائستہ یوسف (صدر محفل نساء) جناب سید احمد ایثار اور ڈاکٹر زاہدہ بیگم

بنیاد گزار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۷۹ شمارہ: ۱۲ ماہ: دسمبر سال: ۲۰۱۷ء

مجلس ادارت

❁ سرپرست: راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر جی

❁ صدر: جناب زاہد علی خاں

❁ معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور

مجلس مشاورت

❁ پروفیسر گوپی چند نارنگ

❁ جناب مجتبیٰ حسین

❁ پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِ سالانہ

❁ ہندوستان: **300** روپے

❁ پاکستان و بنگلہ دیش: 600 روپے

❁ کتب خانوں سے: **400** روپے

❁ مغربی و عرب ممالک سے 60 ڈالر یا 40 پاؤنڈ

قیمت: -/30

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** **Fax: 040-23374448**

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو' پنجہ گٹہ روڈ' سوماجی گوڑہ' حیدرآباد .082 500 انڈیا

برقی پتہ: ***E-mail: idarasabras@yahoo.in***

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60 روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور نے طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کررہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا
مند پسند اور
آزمودہ نسخہ

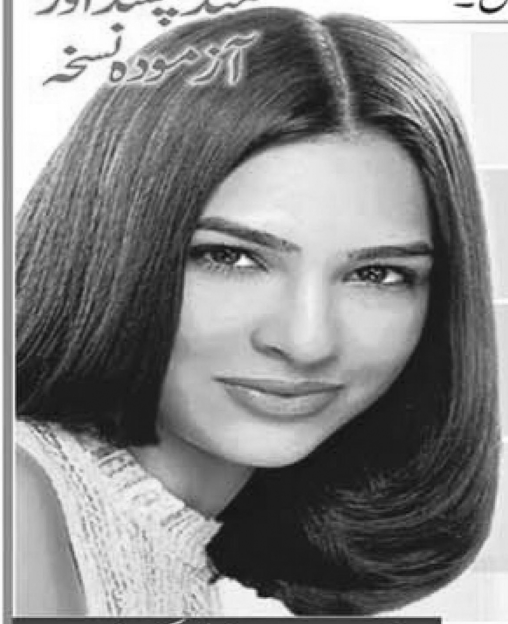

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفادور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑا، منہ سے بدبو آنا وغیرہ، میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان
جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

بربریت ولاقانونیت.....!	بیگ احساس	06

مضامین

''کتابیں'' گلزار کی نظم کا تحلیلی تبصرہ اور تجلیلی تجزیہ	سید تقی عابدی	08
مابعد جدیدیت، نئی فکریات اور بنیادی تبدیلیاں (آخری قسط)	وسیم بیگم	18
دیوان والہ داغستانی کے اہم قلمی نسخوں کا تعارف	تنویر حسن	27
تہذیبی ارضیت نگار: قاضی عبدالستار (افسانوں کے حوالے سے)	محمد شاہد	32
علی عباس حسینی	فرحانہ انجم	39

آپ بیتی

یادیں	راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرا/اشرف رفیع	42

سفرنامہ

آوارگی تھوڑی سی (آخری قسط)	مہتاب قدر	45

طنز ومزاح

مشاہیر یا مساکین	خامہ بگوش	56

افسانے

نواب مرزا	حمید سہروردی	59
آثار قیامت	مشتاق احمد وانی	62

شاعری

حامدی کاشمیری، غلام مرتضیٰ راہی، مصحف اقبال توصیفی، حیدر وارثی رضوان احمد راز،، بدر محمدی، حنیف ترین، رند سرشار، نسیم محمد جان	علیم صبا نویدی، راشد انور راشد، بی ایس جین جوہر،	66

جو وہ لکھیں گے جواب میں

خطوط	اسیم کاویانی، ڈاکٹر شیخ محمود، علیم صبا نویدی، اظہر ابرار، شارق عدیل، رفیق جعفر، ڈاکٹر محمد ناظم علی،	75

اداریہ

بربریت ولاقانونیت.....!

وزیر آعظم نریندر مودی نے اچھے دن لانے کے وعدے پر الیکشن جیتا تھا۔لیکن بد سے بدترین دن آ گئے ہیں۔ جب کوئی الیکشن سامنے ہوتا ہے تو دن اور بھی بُرے ہو جاتے ہیں۔ایسا لگتا ہے ملک میں کوئی قانون ہی نہیں ہے۔راجستھان میں افروز کا قتل اس کی ایک گھناونی مثال ہے۔ایک بےقصور نہتے انسان کو انتہائی بے رحمی اور وحشیانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔اسے ''لو جہاد'' کا ردّعمل قرار دیا گیا۔ایک بےمعنی اصطلاح بنا دی گئی۔جس کے نام پر قتل وغارت گری کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ یہ قتل 6/دسمبر کے حساس دن کیا گیا۔اقلیتیں اس دن بابری مسجد کی شہادت پر احتجاج کرتی ہیں اور بند مناتی ہیں۔ یہ قتل ایک دلت نے کیا جس کا نام شمبھو لال ہے۔ افروز ایک بنگالی مزدور تھا۔جس کا کوئی قصور نہ تھا محض مسلمان ہونے کی وجہ سے اسے ختم کر دیا گیا اور قتل کو لو جہاد، اسلامی دہشت گردی دفعہ 370 اور رام مندر سے جوڑ کر اسے زعفرانی رنگ دے دیا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہندوں اور مسلمانوں نے مل کر اس کے خلاف احتجاج کیا۔ایک سوشیل اکٹوسٹ نے اپنے انٹرویو میں بجا طور پر یہ سوال اٹھایا کہ ایسے موقعوں پر مسلمان لیڈر کیوں آگے نہیں آتے۔ خاموشی کیوں اختیار کرتے ہیں۔صرف چند نوجوان اور کچھ تنظیمیں احتجاجی نعرے لگاتی ہیں۔سوشیل میڈیا پر ان کے بیانات کچھ دن ہلچل پیدا کرتے ہیں پھر کوئی حادثہ ہوتا ہے قاتل آزاد گھومتے ہیں کیوں کہ برسر اقتدار لیڈروں کی انھیں پشت پناہی حاصل ہے۔ایک اور واقعہ کو خوامخواہ لو جہاد قرار دیا گیا۔ ہادیہ اور شفیع جہاں کی شادی کو خوامخواہ ''لو جہاد'' ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔معاملہ سپریم کورٹ میں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہادیہ (پرانا نام اکھیلا) نے تامل ناڈو کے شہر سلیم میں واقع شیوراج ہومیوپیتھی میڈیکل کالج اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیا۔اکھیلا کے ساتھ کیرالا کے اور بھی طالب علم اسی انسٹی ٹیوٹ سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ان طلبہ نے پہلے تو ہوسٹل میں قیام کیا پھر ایک کمرہ کرایے پر لے کر ساتھ رہنے لگے۔ان میں ایک مسلمان لڑکی حسینہ بھی شامل تھی۔حسینہ اور اس کی بہن فسینہ نماز کی پابند تھیں۔ان دونوں بہنوں کے طور طریقوں سے اکھیلا متاثر ہونے لگی اس کی اسلام میں دلچسپی بڑھنے لگی۔اس نے قرآن مجید کا ملیالم ترجمہ بھی پڑھا۔مختصر یہ کہ 10/ستمبر 2015ء کو کوچی پہنچ کر اکھیلا نے اسلام قبول کیا۔2016ء میں ہادیہ گھر سے نکل گئی اس نے ایک وکیل سے سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا کہ اس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے۔19/دسمبر 2016ء کو اکھیلا (مسلم نام ہادیہ) کا نکاح شفیع جہاں سے ہوا۔ادھر ہادیہ کے والد نے ہادیہ کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے سارے ہتھکنڈے استعمال کیے۔شادی کے دو دن بعد ہادیہ 21/دسمبر کو شفیع جہاں کے ساتھ ہائی کورٹ پہنچی تو ہائی کورٹ نے اس کے شوہر کو پابند کیا کہ وہ ہادیہ سے کوئی رابطہ نہ

رکھے۔24 رمئی 2017ء کو کیرالا ہائی کورٹ نے اس شادی کو منسوخ کر دیا۔ شفیع جہاں نے سپریم کورٹ میں اس فیصلے کو چیلنج کیا۔ اگر چہ سپریم کورٹ نے ہادیہ کو کالج بھیجنے کا حکم دے کر اسے کسی حد تک حق دلایا لیکن این آئی اے کو تحقیقات جاری رکھنے کا حکم دیا۔ اس سارے معاملے میں ہادیہ ثابت قدم رہی۔ لیکن یہ لو جہاد کا معاملہ بالکل نہیں ہے۔ دوسری طرف ہندو جاگرن منچ اتر پردیش کے صدر راجو چوہان نے اپنے انٹرویو میں کہا ہے کہ اتر پردیش میں 2100 مسلم لڑکیوں کو ہندو بنا کر ہندو گھروں کی بہو بنایا جائے گا تا کہ وہ تین طلاق کے خطرے سے محفوظ رہ سکیں۔ اس کی باضابطہ مہم چلائی جائے گی۔ ملک میں بین فرقہ جاتی بین مذہبی شادیاں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ دلوں کا معاملہ ہے اسے اس طرح فرقہ وارانہ رنگ دینا اور ملک کی فضا کو مسموم کرنا کہاں تک درست ہے؟ حد تو یہ ہے کہ ''پدماوتی'' کی ریلیز کھٹائی میں پڑ گئی۔ دیپکا پڈکون اور سنجے لیلا بنسالی کے سروں کی قیمت لگائی گئی۔ ان لوگوں کو گرفتار تک نہیں کیا گیا۔ فلم میں سچی تاریخ پیش نہیں کی جاتی یہ سب جانتے ہیں لیکن متعصب ذہنیت کے مظاہرے مسلسل کیے جا رہے ہیں۔

ملک کے دارالخلافہ دہلی میں ایک خاتون کو برسر عام پیٹا گیا اس کو برہنہ کر کے ویڈیو لیا گیا اور وائرل کیا گیا اس کا قصور یہ تھا کہ وہ دہلی خواتین کمیشن کی نشہ نجات، پنچایت کی سرگرم رکن ہے جس نے شراب مافیہ کے خلاف خواتین کمیشن میں شکایت درج کروائی تھی۔ ایک رپورٹ کے مطابق شراب فروخت کرنے والوں کے علاوہ 100، 150 لوگوں نے اس درندگی اور وحشیانہ حرکت میں حصہ لیا۔ دہلی پولیس دہلی حکومت کے تحت نہیں ہے۔ اب نہ تو اقلیتیں محفوظ ہیں۔ نہ خواتین....!! گجرات الیکشن میں وزیر آعظم کے بیانات سن کر بھی حیرت ہوتی ہے وہ راہل گاندھی سے سوال کرتے ہیں کہ وہ رام مندر کے حق میں ہے یا بابری مسجد کے؟ وزیر آعظم کو تو غیر جانب دار ہونا چاہیے۔

فینانشیل ریزولیشن اینڈ ڈپازٹ انشورنس (ایف آر ڈی آئی) بل 2017ء سے عوام میں دہشت پھیلی ہوئی ہے۔ وہ بینکوں میں اپنے ڈیپازٹس کے تحفظ کے بارے میں فکر مند ہیں۔ نوٹ بندی کی دہشت سے ابھی قوم پوری طرح باہر نہیں آئی کہ اب ایک نیا شوشہ چھوڑا گیا۔ خدا خیر کرے!

☆☆

غالب اکیڈیمی نے ایوارڈز کا اعلان کر دیا ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر حسن عباس، پروفیسر شہناز نبی، ڈاکر محمد کاظم اور پروفیسر ارتضیٰ کریم کو مختلف زمروں میں ایوارڈ کا حقدار قرار دیا گیا۔ ہم ان تمام ایوارڈ یافتگان کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

بیگ احساس

سید تقی عابدی

''کتابیں''، گلزارؔ کی نظم کا تحلیلی تبصرہ اور تجلیلی تجزیہ

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں، اب اکثر
گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں
انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے۔
جو قدریں وہ سناتی تھیں
کہ جن کے سیل کبھی مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں
جو رشتے وہ سناتی تھیں
وہ سارے اُدھڑے اُدھڑے ہیں
کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے
کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں
بنا پتّوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ
جن پر اب کوئی معنی نہیں اُگتے
بہت سی اصطلاحیں ہیں
جو مٹّی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا
زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحہ پلٹنے کا
اب انگلی کلک کرنے سے بس اک
جھپکی گذرتی ہے
بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھلتا چلا جاتا ہے پردہ پر
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے
کبھی سینے پہ رکھ کر لیٹ جاتے تھے
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحیل کی صورت بنا کر نیم سجدے
میں پڑھا کرتے تھے، چھوتے تھے جبیں سے
وہ سارا علم تو ملتا رہے گا آئندہ بھی
مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول اور
مہکے ہوئے رقعے کتابیں مانگنے گرنے اٹھانے، کے
بہانے رشتے بنتے تھے
ان کا کیا ہوگا؟
وہ شاید اب نہیں ہوں گے

گلزارؔ نظم کے مستند شاعر ہیں۔ ان کی نظم میں تخیّل جذبات، صداقت سلاست کے ساتھ زبان کا چٹخارہ بھی موجود ہے۔ ان کی نظم اکیسویں صدی کے عصری مزاج سے منسلک ہے اسی لیے مقبول ہے۔ عامی اور عالم دونوں ان کی شاعری کے شیدا ہیں۔ ان کی شاعری میں ترقی پسندی، روایت پذیری، جدیدیت، مابعد جدیدیت کے بعد کی عصری حِس نمایاں ہے جو آج ایک بڑی شاعری کی شناخت اور علامت بھی ہے۔ نکلسن کہتا ہے بڑی شاعری میں اپنے دور کی حسیّت کے ساتھ ساتھ ماضی کی قدروں کا احساس اور مستقبل کے امکانات کا محاسبہ بھی رہتا ہے۔

بیسویں صدی کے دو عظیم اردو شاعر علاّمہ اقبالؔ اور جوشؔ ملیح آبادی جنھوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں ریاضت کی ہے مگر وہ نظم ہی کے شاعر تھے۔ مضمون کا تسلسل واقعات کا اُتار چڑھاؤ

،لہجہ کی رنگارنگی کو غزل کی تنگ دامنی برداشت نہیں کرسکتی۔اسی لیے اُردو نظم نے ڈیڑھ سو سال کے قلیل عرصے میں کثیر فتوحات کیے ہیں۔

گلزار کی نظم ''کتابیں'' اُردو کی شاہکار نظموں کی صف میں نمایاں ہے۔ یہ نظم اگرچہ برصغیر کی ہندوستانی زبان میں پڑھی اور لکھی جاسکتی ہے لیکن اس نظم کے اکثر موضوعات اور جذبات دنیائے ادب کی کتابوں سے بھی مربوط ہیں۔ چنانچہ گلزار کی نظم ''کتابیں'' دنیائے ادب کو تحفہ میں پیش کی جاسکتی ہے۔گلزار کی شاعری ارتقائی منازل طے کر کے ندرت خیال و بیان کے میناروں پر جاگزیں ہوتی جارہی ہے۔مولانا رومؔ نے کہا تھا میری عمر کو تین لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ میں کچّا تھا پک گیا اور پھر فنا ہوگیا۔

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بودم پختہ شدم سوختم

یعنی انسان مہد سے لحد تک سفر کرتا ہوا ان کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ جب انسان پختہ ہوجاتا ہے تو اس کا جسم کمزور مگر اس کی ذہنی فکری قوت قوی اور تجربہ وسیع ہوجاتا ہے اس لیے ہر ہنری کام جو اس پختہ اور فنا کے درمیان ہوتا ہے عظیم ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اسی لیے ہم گلزار سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اسی طرح شاہکار تخلیق کرتے رہیں۔

اس موقع پر سب سے پہلا یہ سوال اٹھتا ہے کہ شعر تخلیقی اُپج ہے یہاں تبصرہ تشریح اور تجزیہ کی گنجایش کہاں ہے؟ اسی لیے بعض شاعروں نے ظاہری طور پر اس نظریہ کی حمایت کی کہ ''شعر مرا مدرسہ کی برد'' اور باطنی طور پر مسلسل مدرسہ کی تختی پر اپنا شعر احباب اور شاگردوں سے لکھواتے رہے۔جن شعرا کے کلام پر تبصرہ تشریح اور تجزیہ کیا گیا انہی کا اکثر کلام تشہیر ہوکر شعری تہذیب کی تربیت ثابت ہوا۔ اگرچہ تنقید میں تنقیص اور تعریف دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ مرزا غالبؔ جس کے آگے اُردو کے اغلب شعرا مغلوب ہیں درجنوں خطوں میں اپنے اشعار کی تشریح اور توضیح خود کرتے ہیں اس کے باوجود آج پچاس سے زیادہ شرحیں ان کے کلام پر نظر آتی ہیں۔تنقید مدح سرائی کا نام نہیں۔تنقید جانب داری کا کام نہیں۔تنقید معماّ سازی اور چیستان کا جام نہیں اسی وجہ سے صحیح تنقید عام نہیں۔تنقید نوک خار سے گل کو پَر پَر کردینے کا عمل نہیں بلکہ گُلوں کو شعری گلدستہ میں سجا کر پیش کرنے کا نام ہے۔اگرچہ اس گلدستے میں شامل خار و خاشاک کا بھی ذکر ہو۔اسی لیے تو جوشؔ نے نقاد کو للکارا تھا۔

رحم اے نقاد فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو
کوئی نوک خار سے چھوتا ہے نبض رنگ و بو
یعنی اک لَے سے لب ناقد کو کھلنا چاہیے
پنکھڑی پر قطرہ شبنم کو تلنا چاہیے
کون سمجھے شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

پس انسان جب خود اپنی پیٹھ کو دیکھنے کے لیے آئینہ کے چہرے یا کسی چہرے کی دو آنکھوں کا محتاج رہتا ہے تو شعری اُپج جو تحت شعور کا جذباتی سیلاب ہے اس میں تیر کر پار اُترنے کے لیے پیراکی کے ساتھ ساتھ ہواؤں کے مزاج موجوں کے دباؤ اور ساحل کی سمت کے علم کا محتاج رہنا پڑتا ہے۔

ایک کامیاب اور کارآمد تشریح اور تجزیہ سے صاحب تصنیف، پڑھنے والے اور ادب کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے ہدف پوری طرح سے صحیح اس لیے بھی نہیں کہ تخلیق زندگی سے جدا نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ادب سے ہدف مکمل طور

پر علاحدہ نہیں ہوسکتا۔ آیئے اس گفتگو کے بعد نظم کا تحلیلی سفر تجزیاتی حوصلے کے ساتھ کریں۔

نظم منظر کشی سے شروع ہوتی ہے۔

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں

یہاں گلزار نے ایک شیشے کی الماری میں رکھّی ہوئی کتابوں کو تخیّل کی نگاہ سے دیکھ کر صنعت حسن تعلیل کو جذبات کے ساتھ پیش کیا۔ چنانچہ اب ہر سننے اور پڑھنے والے کو الماری کی کتابیں شیشوں سے جھانکتی اور حسرت سے تکتی نظر آنے لگیں۔ یہ فطری شاعر کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ وہ ان کہی بات کو کہاوت اور ناموجود کو وجود کا جسم عطا کر دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے آنکھ وہ شئے نہیں دیکھ سکتی ذہن جس کو نہیں جانتا۔ ہم سب نے ہزار بار الماریوں میں کتابیں دیکھیں لیکن کسی نے گلزار کی طرح شعری بصیرت کو چشمی بصارت میں تبدیل نہیں کیا یعنی گلزار کی طرح قطرہ میں دجلہ نہ دیکھا اور نہ دکھایا۔

شاعری الفاظ سے زیادہ معنی سے سروکار رکھتی ہے۔ معنی کثیر اور لفظ قلیل ہونے کے باعث، معنی الفاظ کے اطراف بکھرے پڑے رہتے ہیں لیکن چونکہ معنی کا کوئی جسم نہیں ہوتا اس لیے سطروں سے زیادہ بین السطور مطالب تہہ در تہہ نامری طور پر موجود رہتے ہیں جنھیں ہر شخص اپنی فکر اور ہمّت کے مطابق حاصل کرسکتا ہے۔ یہاں شاعر الماری میں بند کتابوں کی منظر کشی کے دروازے سے ایک بہت بڑے ذہنی میدان میں ہمیں داخل کر رہا ہے۔ جہاں جدید اور روایتی تہذیب کی قدروں کا منظر نامہ مناظرہ اور محاسبہ ہے۔

عشق کا سوز و گداز عاشق اور معشوق دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ ''دل بہ دل راہ دارد'' کے معنی بتاتے ہیں کہ یہ راستہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ یہاں کتابیں معشوق اور قاری عاشق ہیں۔ یہاں معشوق حسرت کی نظر اور بے چینی سے یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کا قدیم عاشق اب کمپیوٹر کے نظاروں میں اپنی شامیں گزارتا ہے۔ عاشق معشوق کے جلوے سے دوری اختیار کر چکا ہے۔ چنانچہ اب کتابیں بیداری میں نہیں بلکہ خواب میں قاری سے ملاقاتیں کرتی ہیں۔

جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں، اب اکثر
گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں
انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں

شاعر نے نظم کے چہرے میں کتابوں سے دوری، کتابی ریڈرشپ کی کمی اور موجودہ دور میں کمپیوٹر اور ڈیجیٹل ٹکنالوجی کی ترقی اور گلوبل ولیج کے ماحول سے وابستگی کے حقیقی اور سچے اثرات کو شعری رس میں گھول کر جذبات کے ساغر پیش کیا۔ شاعر نے فوراً روایت سے رشتہ جوڑ کر ذہن کو جھنجھوڑا کہ انہی کتابوں میں جو انسانی، سماجی، علمی، اخلاقی اور مذہبی قدریں اشعار میں، خاکوں، کہانیوں، افسانوں، ڈراموں، ناولوں میں پڑھی اور سُنی جاتی تھیں وہ ذہن کے خانوں میں ہمیشہ زندہ اور تازہ رہتی تھیں آج موجود نہیں۔ یہی نہیں بلکہ انسانی اور خاندانی رشتے جن سے سماج اور خاندان بندھا رہتا تھا وہ بندھن جس کا تذکرہ وہ تہذیب و تربیت، طور و طریقہ جو تخلیقی شہ پاروں کی وجہ سے کتابوں کے نقش کے ذریعے دل و دماغ پر ثبت ہوتا تھا آج بگڑ چکا ہے۔

جو قدریں وہ سناتی تھیں
کہ جن کے سیل کبھی مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں

جو رشتے وہ سناتی تھیں
وہ سارے اُدھڑے اُدھڑے ہیں

انسان اشرف المخلوقات صرف شعور ذات کی وجہ سے ہے۔ ورنہ بدنی اور حسّی طاقتوں کے لحاظ سے دوسری مخلوقات سے بہت نیچے ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ پانچ چھ فٹ کے انسان کے سامنے پوری کہکشاں چھوٹی ہے۔ انسان اس قدر عظیم صرف انسانی عالی قدروں اور اس کے رشتے عبد اور معبود سے ہے۔ مقام انسان، حقوقِ انسان، احترام انسان کا تعین قدروں اور رشتوں سے ہے۔ قدروں کے آفتاب کی ایک شعاع اخلاق ہے۔ یہاں گلزار نے آج کے پُر آشوب مادّی ماحول میں روحانی بالیدگی کی کمی کا خوب صورت اشارہ کیا ہے کہ کتاب ہی وہ صحیفہ ہے جس میں اخلاقیات کا ہر درس نظر آتا ہے۔

اوپر کے مصرعوں اور فقروں میں ''قدریں''، ''سیل'' اور ''رشتے''، ''ادھڑے'' صنعت ایہام میں ہیں یعنی ایک تو ان کے قریبی معنی ہیں اور دوسرے ''دور'' بعید معنی ہیں جو شعر کی عظمت کے نقیب ہیں۔ کتابیں جو قدریں سناتی ہیں وہ ہمیشہ ہمارے ذہن میں زندہ رہتی ہیں، دوسرے معانی یہ ہیں کہ انسانی قدریں زندۂ جاوید ہیں۔ ہمیشہ زندہ رہیں گی جن کی سخن گو کتاب ہے۔ رشتہ ایک معنی میں وہ دھاگا ہے جو باندھنے اور بُننے کے کام آتا ہے دوسرے معنی میں وہ تعلق ہے جو انسان سے انسان کو اور انسان کو معبود سے ہے۔

گلزار نے نظم میں تخیّل کے ساتھ تنوع بھی برتا ہے جو آسان کام نہیں۔ نظم میں غزل کے مقابل آزادی تو ہے مگر یہ آزادی نظم کی بربادی ہو جاتی ہے اگر شاعر تخیّل کی آماج گاہ کو نظم کے بہاؤ کے ساتھ سازگار نہ رکھّے یا ذہنی مضمون کے تسلسل کو مجروح اور مخدوش کر دے۔ گلزار اس لیے بھی عمدہ نظم کے شاعر ہیں وہ ان نکات کی باریکیوں اور رموز سے واقف ہیں۔ یہ عمل ریاضت سے نہیں بلکہ سعادت سے ظاہر ہوتا ہے۔

''کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے'' یہ نظم کا سب سے اہم حصّہ ہے جس نے اس نظم کو شاہکار نظموں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ اس حصّے میں شاعر نے کتاب کے صفحے پر یا کمپیوٹر کے پردے پر ظاہر ہونے والے کلام پر کلام کیا ہے۔ یہ درحقیقت آج کل کی بعض شائع ہونے والی کتابوں یا فیس بک پر تکمیل کی جانے والی شاعری اور تخلیق نما کاوشوں پر صحیح ریویو ہے۔ اگر کتاب کا صفحہ پلٹتے وقت سسکی نکلتی ہے تو کتاب جو درست اور عمدہ شاعری کا خزانہ تھی رو رہی ہے کہ یہ کیا میرے اندر بھرا جا رہا ہے۔ اگر یہ کمپیوٹر پر صفحہ بدلتے سسکی ہو رہی تو شاعری رو رہی ہے کہ آج کے دور میں میری کیا حالت ہو گئی ہے۔

یہاں گلزار نے لفظ و معنی پر بحث کی ہے اور نادر تشبیہات اور استعارات سے ترسیل و ابلاغ کا کام نکالا ہے۔ یہاں شاعر نے روایتی اور جدید شاعری کا تقابل بھی کیا ہے۔ یہاں گلزار نے لفظوں کو استعاروں میں ڈھالا ہے۔ فیض احمد فیض نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا لفظ کو استعارہ بنانا میں نے غالب سے سیکھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ غالب سے بڑا استعارہ کا خالق اردو ادب میں نہیں گزرا کیونکہ وہ لفظ شناس اور معنی پرور تھے۔ قدیم عظیم شعرا ایسے چندہ اور حسب ضرورت الفاظ استعمال کرتے کہ ایک لفظ اگرچہ دیکھنے میں اک شجر کی طرح ہوتا مگر اس میں کئی معنی کے پھل اُگتے اور غالب اسی کو گنجینہ معنی کا طلسم کہتے ہیں۔ گلزار کہہ رہے ہیں کہ اب تو الفاظ کے درختوں پر معنی کے پھل نہیں اُگتے یہی نہیں بلکہ لفظ بغیر پتوں کے سوکھے ٹنڈ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بالکل نیا مضمون ہے۔ یہی ندرت فکر و بیان ہے یہی بڑی شاعری کی پہچان ہے۔ آج کل کی تکمیل کردہ کتابی یا ڈیجیٹل شاعری جس میں الفاظ اور معنی

کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے ایک جدید بحرانی کیفیت کا حامل ہے جس کی اصل وجہ شعری ذوق کا فقدان ہے۔ ایک کامیاب شاعر اپنے تجربات کو سننے والے کے تجربات سے جوڑ کر اس کا اثر دوآتشہ کر دیتا ہے:

ع: میں نے یہ جانا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں
بنا پتّوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ
جن پر اب کوئی معنی نہیں اُگتے

گلزار یہاں لفظ و معنی سے گزر کر محاسن شعری سے دوری کو خود دیکھتے ہیں اور ہمیں دکھاتے ہیں۔ روایتی قدیم میخانوں کے اطراف و اکناف میں آج بھی مٹی کے ٹوٹے پھوٹے پیالے جنھیں پھینک کر شیشے کے بلوری ساغروں میں شراب دینے کا طریقہ رواج پا چکا ہے یہ جدیدیت کا اثر ہے اگرچہ میخار جانتے ہیں سفالی سبو میں پینے کا مزا اور ہے ورنہ حضرت غالبؔ نہ کہتے: جام جم سے یہ میرا جام سفال اچھا ہے۔

اصطلاحات تلمیحات شعری خزانوں کی کنجیاں ہیں لیکن آگاہی اور علم نہ ہونے کی وجہ سے یہ چمنستان چیستان میں تبدیل ہو چکا ہے اور اسے شاعری میں ترک کر دیا گیا ہے جیسے سفالی سبو اب متروک ہو چکے ہیں۔

بہت سی اصطلاحیں ہیں
جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا

شاعر ہر قدم پر سننے والے کو اپنے تجربے میں شامل کر رہا ہے۔ وہ اسے اُن معمولی اور چھوٹے چھوٹے جزئیات میں شریک کرتا ہے جسے اُس نے لاشعوری طور پر کیا لیکن اب اس کا ذائقہ محسوس کر رہا ہے جو کمپیوٹر پر انگلی سے کلک کرنے پر نہیں ہوتا

اگرچہ یہاں صفحات لاتعداد کھلتے چلے جاتے ہیں۔

زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحہ پلٹنے کا
اب انگلی کلک کرنے سے بس اک
جھپکی گزرتی ہے
بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھلتا چلا جاتا ہے پردہ پر
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے

انسانی ذہن مشق آموز ہے۔ وہ وہی کرے گا جس کی اُسے تعلیم دی گئی ہے۔ جس شخص نے کتابی مطالعہ کیا ہے وہ کمپیوٹر کے صفحہ پر اُسی کتاب کو ذوق و شوق سے نہیں پڑھ سکتا۔ عادت بدلنے کے لیے عمر کافی نہیں۔ چنانچہ کتاب کا صفحہ پلٹنے ہوئے ذہنی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پرانی کتابوں میں صفحات کے نیچے اُس لفظ کو لکھتے تھے جس سے آگے کا صفحہ شروع ہوتا تھا۔ جس کی ایک وجہ تو آئندہ صفحہ کا تعین تھا مگر اس سے زیادہ ذہنی موضوع اور خیال و فکر کا تسلسل تھا تاکہ اس میں فاصلہ نہ ہو۔ چونکہ ذہن الکٹرونک موجوں کا کرشمہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کتابی صفحہ ذہن میں موضوع کو متلاشی ہونے نہیں دیتا اور اسی کی طرف اس فکری نشّہ کا اشارہ ہے جسے گلزار نے ذائقہ نام دیا ہے۔

یہاں تک گلزار نے کتاب کی معنوی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اب نظم کا وہ حصّہ ہے جس سے عوامی تعلق اور نظم کی شہرت کا تعلق ہے۔ یہاں شاعر نے کتاب کی صوری کیفیت اس کے جمال قدو خال اندرونی حال سے زعفران بکھیری ہے۔ چنانچہ اس حصّے میں رنگارنگی کے ہمراہ پھولوں کی نرمی کے ساتھ ساتھ محبت کی خوشبو بھی شامل ہے جس سے ہر فکر عطرِ نظم سے معطّر ہو جاتی ہے۔

ایک عمدہ شاعر جب منظر کشی میں سہ بُعدی Three dimensional حالت پیدا کرتا ہے تو وہ مرقع کشی ہو جاتی ہے۔ منظر سے منظر کو جوڑ کر یہاں مضمون کو رفعت دے کر عقیدتی بلندی پر

گلزار نے کتاب کو رحیل پر نیم سجدہ حالت میں پڑھا کر آسمانی صحیفہ کر دیا جو کتاب کی معراج ہے۔

کبھی سینے پر رکھ کر لیٹ جاتے تھے
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحیل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے چھوتے تھے جبیں سے

ان مصرعوں میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کی جھلک بھی ہے۔ یہاں معشوق کے خدوخال اور معبود کے کلام وجلال کی نسبت سے سینے پر رکھ کر گودی میں لے کر اور رحیل کی صورت یا نیم سجدے کی حالت میں گفتگو ہے۔ یہ ہمارا معاشرتی نظام کی تہذیب ہے جس کو سومناتی خیال کہتے ہیں۔ اس تہذیب اور تربیت کا کسی خصوصی مذہب اور دھرم سے تعلق نہیں بلکہ یہ برصغیر کے کلچر اور ہزاروں سال سے پیوستہ پنڈتوں کے حیات وممات کے فلسفہ سے مربوط ہے۔ جس کا ذکر امیر خسروؒ، کبیر داس، بیدلؔ، غالبؔ اور بیدیؔ کے پاس بھی ہے۔

اس نظم کا آخری حصّہ دلکشی کا محور ہے۔ یہاں نظم رومانی دائروں میں گھومتی ہے۔ شاعر یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ سارا علم تو ملتا رہے گا آئندہ بھی۔

یہ سچ ہے کہ گذشتہ بیس (۲۰) سالوں میں کمپیوٹر نے اتنا علم ذخیرہ کیا ہے جو دنیا نے کبھی ایک جگہ جمع نہیں کیا تھا چنانچہ علم کے پیاسے کو علم کا سمندر تو ملے گا

مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول
مہکے ہوئے رقّعے
کتابیں مانگنے گرنے اٹھانے کے بہانے رشتے بنتے تھے
ان کا کیا ہوگا
وہ شاید اب نہیں ہوں گے

یعنی کتابی متن تو کمپیوٹر اور موجوں میں آجائے گا لیکن کتابی خدوخال سے وابستہ حسن وعشق کے معاملات، ملاقات، تبرکات، یادداشت، واقعات وغیرہ کبھی بھی سحر بن کر ہماری اُفق پر ظاہر نہ ہوں گے۔ نظم کے متن پر تفصیلی تبصرہ کرنے کے بعد ہم اس نظم کے اہم شعری ادبی نکات پر روشنی ڈالیں گے۔ گلزار کی نظم کے سرسری اور دقیق مطالعے سے جو شعری ادبی فنّی قدریں ہمیں نظر آتی ہیں اُن میں سے چند کا ذکر ضروری ہے۔

ا۔ ''کتابیں'' اُردو نظم ہے لیکن ہندوستانی عام فہم زبان میں لکھّی گئی ہے۔ حالؔی کی ''مناجات بیوہ'' سُن کر جب گاندھی جی رو پڑے تو مولوی عبدالحق نے کہا تھا اس سے عامی اور عالم دونوں متاثر ہیں۔ یہ نظم ہندوستانی زبان میں لکھّی گئی ہے۔ چنانچہ ''کتابیں'' بھی اردو رسم الخط نستعلیق میں ہو یا ہندی دیوناگری یا انگریزی رومن حروف میں لکھّی جائے نظم کے بیان بہاؤ اور اثر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اسے صفائی، سادگی اور سلاست کہہ سکتے ہیں جو ماحول اور مکان کے تحت اچھا شاعر اپناتا ہے۔

ب۔ پوری نظم میں ایک بھی اضافت یا ترکیب نظر نہیں آتی۔ اگرچہ عربی اور فارسی کے اردو میں مستعملہ الفاظ جیسے صحبت، الفاظ، معنی، اصطلاحیں، تہہ، علم، رحیل، سجدے، جبین، رقعے، رشتے وغیرہ وغیرہ مصرعوں میں نگینوں کی طرح جُڑ دیے گئے ہیں۔ مصرعوں میں ان الفاظ کا کوئی حرف تلفظ میں ادھ بیان یا دب نہیں گیا۔ شاعری میں یہ استطاعت کہنہ مشقی اور شعر کی نوک و پلک سنوارنے کی ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔ میر

انیسؔ کے نواسے میر مانوسؔ نے مسعود حسن ادیبؔ سے گفتگو میں کہا تھا کہ یہ افواہ غلط ہے کہ انیسؔ چادر تان کر نیم نیند کی حالت میں شعر کہتے تھے بلکہ تمام رات کنول جلا کر محنت و ریاضت سے اشعار کی نوک و پلک سنوارتے یعنی سیروں خون خشک کرتے جب جا کر ایک آبدار شعر ظاہر ہوتا۔ ''کتابیں'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ گلزار نے نظم کے مزاج لہجہ بناؤ سنگار پر اپنی فطری شاعری کی ثروت کے ساتھ فنی رکھ رکھاؤ پر وقت صرف کیا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے شہکار عرق ریزی، دیدہ وری اور پُرکاری سے وجود میں آتا ہے۔

ج: ''کتابیں'' آزاد نظم کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ اس کو مزید مغربی نیوورس New Verse سے جوڑ سکتے ہیں جو آج کل برصغیر کی مختلف زبانوں کی شاعری میں رواج پا رہی ہے۔ یہاں عموماً زبان کتابی نہیں بلکہ تکلّمی رہتی ہے۔ یعنی نظم میں طرز بیان مصنوعی اور بناوٹی نہیں بلکہ اصلی اور فطری ہوتا ہے۔ جہاں تک بحر کے بہاؤ کا تعلق ہے مصرعوں کی بندش اُسی طرح ہوگی جیسے بات کرنے کا انداز یعنی جہاں رُکنا ہو، رُکیں۔ جہاں زور دینا ہے وہاں زور دیں، جہاں گفتگو کو ایک لہجے میں بیان کرنا ہو بیان کریں۔ چنانچہ مصرعوں کی لمبائی تکلّمی (Speech Rythm) آہنگ پر منحصر ہوتی ہے اسی لیے ''کتابیں'' میں بعض مصرعے تین لفظی اور بعض دس گیارہ لفظوں سے بنے ہیں۔

اس نیوورس اور تکلّمی آہنگ کی وجہ سے نظم کی ترسیل اور تفہیم میں بڑی مدد ملی ہے۔ چنانچہ جب گلزار اس نظم کو پڑھتے ہیں تو مصرعوں کے اُتار چڑھاؤ، لہجے کے زیر و بم سے اس کے اثر کو دو آتشہ کر دیتے ہیں۔

یہ نظم ایک اچھی مثال ہے اُردو آزاد نظم میں نیوورس کی قدروں کو اپنانے کی اسے مابعد جدیدیت کے بعد کی عصری شاعری کا نمونہ سمجھا جائے۔

د: مصرعے فقرے بلکہ نظم روز مرہ میں ہے۔ الفاظ کی نشست اسی طرح کی ہے جیسے ہم بولتے ہیں جو نظم کا حُسن اور کمال بھی ہے۔

ھ: نظم میں ہندی کے رسیلے شبدوں کے علاوہ انگریزی کے مروجّہ الفاظ برتے گئے ہیں جو اکیسویں صدی اور گلوبل ولیج کی موجودہ شاعری کی پہچان بھی ہے۔ برصغیر کا مختلف زبانوں کا ماحول، انگریزی زبان کی ملکوں اور ٹکنالوجی پر دست اندازی اور تاثیر اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ان انگریزی یا خارجی الفاظ کا متبادل لفظ جو فارسی یا عربی لوگ کر لیتے ہیں ہم بھی کر سکے۔ اس لیے ہم اسے اپنی زبان میں مستعملہ لفظ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ اس سے نظم کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی جیسے:

کمپیوٹر کے پردوں پر
انگلی کلک کرنے سے
گلاسوں نے انھیں

یہی نہیں بلکہ اگر کوئی ادق اور غیر مانوس انگریزی لفظ بھی آجائے تو اسے لفظوں کی نشست سے مانوس بنا لیتے ہیں جیسے

کہ جن کے (Cell) کبھی مرتے نہیں تھے۔

گلزار کے اس تجزیہ سے دنیا کی زبانوں کے سائنٹفک مطالب آسانی سے اردو نظم و نثر ہو سکتے ہیں۔

و: اس نظم کے چند محاسن زبان و بیان اور صنائع لفظی و معنوی کو یہاں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

1. نظم میں سادگی شگفتگی روانی اور صفائی موجود ہے جو عموماً روزمرہ کی وجہ سے ہے۔

2. نظم میں بعض مطالب منظر کشی کے ہیں جو مرقع کشی بن چکی ہیں۔

3. محاورے حسب ضرورت اپنے صحیح مقام اور صحت کے ساتھ ہیں۔

جیسے حسرت سے تکنا
سسکی نکلنا
نیند میں چلنا وغیرہ

4. زود فہم تشبیہات اور استعارات:

— جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
(سکوروں کی طرح)

— کبھی گھٹنوں کو اپنے رحیل کی صورت بنا کر
(رحیل کی صورت)

— بنا پتّوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ
(سوکھے ٹنڈ)

— گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا
(گلاسوں)

5. صنعت تعلیل: شاعر ایک عام کیفیت کو دوسرے معانی میں پیش کرتا ہے جیسے پتنگا جو شمع کے شعلے سے جل جاتا ہے وہ ایک حادثہ اور غفلت ہے مگر شاعر اُسے عشق قربانی اور پیار بتاتا ہے اور لوگ شاعر کے خیال کو مان لیتے ہیں۔

— کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
(زندہ شے دیکھ سکتی ہے)

— حسرت سے تکتی ہیں
(زندہ شے جذبہ حسرت رکھتی ہے)

زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحہ پلٹنے کا
(انگلی کو تھوک لگا کر صفحہ ذائقہ کے لیے نہیں صرف ایک صفحہ اٹھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں)

6. صنعت مراعات النظیر: ایک ہی کیفیت، حالت، موضوع، مطالب کے الفاظ شعر میں لانا۔ جیسے: لفظوں، معنی، اصطلاحیں، متروک وغیرہ

پتّوں۔سوکھے۔ٹنڈ۔اُگتے

—انگلی۔سینے۔گودی۔گھٹنوں۔جبیں

—پھول، سوکھے۔مہکے وغیرہ

7. صنعت تکرار: الفاظ کی مصرعوں میں تکرار

—ادھڑے ادھڑے

—تہہ بہ تہہ

یہی نہیں بلکہ صنعت تجنیس، ابداع، تضاد وغیرہ کی مثالیں اس نظم میں موجود ہیں۔بعض ایسی بھی صنعتیں نظر آتی ہیں جن کے نام نہیں۔کیا ہم نے جنگل میں اگنے والے ہر پھول کو نام دیا ہے۔شاید آئندہ وقت ان صنعتیوں کو بھی نامی گرامی گرے گا۔

ز: ایسی نظموں کو تدریسی نصاب میں شامل کیا جائے۔ چونکہ گلدستہ کی طرح ان میں کلاسک موضوعات کے علاوہ ترقی پسند عناصر، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور عصری حسیّت کی جھلکیاں موجود ہیں جو زبان کے تحفظ اور ارتقا میں ضرور ہیں۔ہم نے مضمون کی طوالت کو

پیش نظر رکھتے ہوئے اس نظم میں شامل علامات اشارات اور پیکر تراشی کے نمونے یہاں بیان نہیں کیے۔

ح: انسانی ذہن کی کیفیات شعور (Consious) تحت شعور (SubConsious) اور لاشعور (Un Consious) کے تحت ہیں۔ شعر کی تخلیق کا مبدا لاشعور ہے جسے ہم درک نہیں کر سکتے جیسے کائنات کے بلاک میٹریل کو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اِسے شعری زبان میں الہام کہتے ہیں (Black Matter) لاشعور سے خیال جب تحت شعور کی فضا میں آتا ہے تو الفاظ کا جسم پہن کر آتا ہے کیونکہ تحت شعور اور شعور میں جسم کا ہونا ادراک کے لیے لازمی ہے۔ جب خیال کا پرندہ لفظوں کا جسم پہن کر ذہن کی فضا میں اُڑتا ہے تو فوراً شاعر اُسے صحیح اور موزوں کر کے قرطاس کے قفس میں ہمیشہ کے لیے قید کر لیتا ہے جس کو ہم شعر کہتے ہیں پھر اس کی شعور کی مدد سے نوک و پلک سنوارتا ہے۔ آمد اور آورد میں فرق یہی ہے کہ آمد کے آسمان پر خیالات کے نادر جھنڈ لہراتے رہتے ہیں جو مبدائے قدرت نے انھیں لاشعور میں بھر دیے ہیں۔ چنانچہ فطری شاعری اچھے اشعار اور انتخاب در انتخاب کر کے شعر پیش کرتا ہے۔ راقم نے گلزار کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور یقیناً وہ اس سعادت سے فیض یاب معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں چاہیے قلم ہاتھ میں رہے اور سینوں اور دماغوں کے صندوقوں میں بند خیالات یہیں اُگل دیں۔ ہم جانتے وہ بہت مصروف شخصیت ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کے فلم انڈسٹری کی یاد بود کتنے عرصے تک رہے گی مگر یہ مجھے معلوم ہے وہ اپنی شاعری کی وجہ سے زندۂ جاوید رہیں گے۔

☆ تجزیہ سے حاصل ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ شاعر کو اپنے دور کے ماحول اور قاری، سامع کے معیار کو دیکھ کر شاعری کرنا چاہیے یا اُسے کسی بھی عنوان پر اپنی فکری بلندی، تجربہ اور علمیت سے حاصل ہوئی عظمت کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری نظر میں ایسے ہی شعرا آج بھی صدیاں گزرنے پر زندہ ہیں جنھوں نے تحسین ناآفرین کی خاطر اپنی آفرینی شاعری کو قربان نہیں کیا۔ شاعر کو چاہیے کہ تمام نادر مشکل فہم مضامین بھی جو اُس کی گرفت میں آسکے سادے یا مشکل ادق الفاظ میں باندھے اور جو موقع پر سنانا ہے سنائے۔ اس طرح ''چھپ نہیں سکتا ہے شاعر شعر کے چھپنے کے بعد'' ہم نے بعض ویڈیوز میں دیکھا ہے گلزار ان مصرعوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ جو ماحول کی مناسبت اور سامعین کی موجودگی کے باعث ٹھیک عمل ہے۔ اصطلاحیں اور متروک الفاظ آج کے سب سامعین سمجھ نہیں سکتے۔

بہت سی اصطلاحیں ہیں
جو مٹی کے سکوروں کی
طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انھیں متروک کر دیا ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ تنقید اور تشریح سے صاحب تصنیف اور ادب کو بھی فائدہ پہنچا ہے جس طرح صاحب تجزیہ اور قاری و سامع اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو حافظ نے ان لوگوں کو سراہا تھا جنھوں نے اُس پر تنقید کی تھی کہ ان کی وجہ سے میں سیدھے راستے پر گامزن ہوں۔ ہزار سال پرانے عربی شاعر

ابونواس کا ذکر تجزیہ کے ذیل میں بے سود نہیں۔ ابونواس بغداد کی گلیوں سے گزر رہا تھا اُس نے ایک مکتب کے معلّم کی آواز سنی جو شاگردوں سے پوچھ رہا تھا اچھا یہ بتاؤ ابو نواس نے کیوں کہا۔ (ترجمہ) اے ساقی شراب پلا اور یہ کہہ کر پلا کہ شراب ہے۔ یہاں شاعر کیوں کہہ رہا ہے۔ یہ کہہ کر پلا کہ شراب ہے۔ ابونواس چھپ کر سنتا رہا۔ شاگردوں نے باری باری سے جواب دیا پھر معلّم نے کہا کہ بات یہ ہے جب ساغر شراب اس کے ہاتھ سے لمس ہوگا تو قوت حسّیہ سے اُسے سرور ہوگا۔ جب ساغر شراب اس کی نظروں سے ٹکرائے گا تو قوت باصرہ سے اس کو نشہ چڑھے گا۔ جب ساغر شراب اس کی ناک کے قریب آئے گا تو قوت شامّہ سے ترنگ حاصل ہوگا جب شراب کا قطرہ زبان پر پڑے گا تو قوت ذائقہ سے وہ مست ہوجائے گا۔ اب صرف ایک حواس سننے کا شامل نہ تھا۔ چنانچہ جب شراب کا نام سنے گا تو اس کا نشّہ دوآتشہ ہوجائے گا۔ یہ سن کر ابونواس دوڑا ہوا معلّم کے پاس آیا اور اسے گلے لگا کر کہا کہ ''بخدا شعر کہتے ہوئے میں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا میں نے تو فقط یوں ہی کہہ دیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے شعر فہمی بعض اوقات شعر گوئی سے مشکل ہوتی ہے۔

جب ناقد تفصیل سے کسی کی تشریح، تجزیہ اور تحلیل کرتا ہے تو صاحب تصنیف یعنی شاعر کے لیے نئے فکری زاویے قائم ہوتے ہیں اسی لیے تنقید بھی تخلیقی ادب میں شمار کی جاتی ہے۔

آخر میں یہی کہوں گا کہ راقم نے گلزار صاحب کا تقریباً تمام مطبوعۂ کلام پڑھا ہے۔ بعض اشعار پر تنقیدی تشریحی اور تجلیلی حاشیے کتابوں میں لکھّے ہیں۔ مغرب کی مشینی زندگی پھر ایک انار سو بیمار کی حکایت نے ابھی وہ موقع فراہم نہیں کیا جو ہم ایسے عمدہ شاعر کا مکمل تنقیدی اور تشریحی جائزہ لے سکیں۔ اگرچہ گلزار پر کئی تشریحی اور تنقیدی مضامین چھپ چکے ہیں لیکن پھر بھی یہ ایک بڑا قرض ہے جو اردو کے ناقدین اور شارحین کو چکانا چاہیے۔ شاید اس کی قسط جلد میں خود ادا کروں۔ ادب کی دھنک میں مختلف رنگوں کی آمیزش ہے۔ اس لیے اس کا حُسن اختلاف کے رنگ سے بھی بنا ہے۔ چنانچہ ہماری تحریر اگرچہ مستند حوالوں سے بنی اور بُنی گئی ہے مگر اس میں نظری اختلاف کی گنجائش ہے۔ توقع ہے کہ گلزار اسی طرح مسلسل تخلیقی جواہر معدن فکر سے بازار سخن میں پیش کرتے رہیں۔ یہ سچ ہے جس کا اشارہ فیضؔ نے کیا تھا۔

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازار سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گُہر جائیں گی

''کتابیں'' بتاتی ہے افسردگی کی ضرورت نہیں۔ اب صرف بازاروں میں نہیں بلکہ میلوں، کالجوں اور پردیس کے شہروں میں بھی جوہریوں نے دکان کھول رکھی ہے۔

OOO

ساہتیہ اکادمی

کے زیر اہتمام

ہندوستانی ادب کے معمار

کے سلسلے کی ایک کڑی

شاذ تمکنت

بیگ احساس

قیمت: 40 روپے

ملنے کا پتہ: رویندر بھون، 35 فیروز شاہ روڈ،

نئی دہلی 110 001

سیلس آفس، سواتی مندر مارگ، نئی دہلی 110 001

مضمون

مابعد جدیدیت، نئی فکریات اور بنیادی تبدیلیاں (آخری قسط)

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے متن پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے مضمون 'کیا تنقید کی بدلتی ترجیحات اور رویہ ہمیشہ نظریاتی اور اقداری نہیں ہوتے' میں لکھتے ہیں:

''معنی کی تعبیریں نہ صرف تاریخ کے تناظر پر بدلتی ہیں بلکہ جو دوسرے زاویہ ہائے نظر ہیں، Ideology کی وجہ سے فلسفۂ ادب (Theory) کی وجہ سے وہ بھی معنی کی تعبیروں کو بدل دیتے ہیں۔ دریدا کی اس بات میں وزن ہے کہ meaning is infinite کیوں کہ context is infinite ہر تناظر کے ساتھ، قاری کی ہر نسل کے ساتھ، تاریخ کے بدلاؤ کے ساتھ، آپ کے تقاضے Text متن سے بدل جاتے ہیں۔''

(جدیدیت کے بعد، ص188)

کوئی بھی ادب پارہ ہو یا فن پارہ وہ اپنی جگہ اساسی طور پر مکمل ہوتا ہے لیکن جہاں تک اس کی معنی آفرینی کا تعلق ہے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ فکر وفہم کے دائرے بھی بدلتے رہتے ہیں مگر اس کی وجہ سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنی جگہ مکمل نہیں ہے۔ Structure یعنی بنیادی ڈھانچہ ہر اعتبار سے مکمل نہیں ہوتا لیکن وہ ایک مکمل یونٹ ضرور ہوتا ہے، اس میں جو الفاظ آتے ہیں ان پر تنقید ہوسکتی ہے اور ہوتی رہی ہے۔ جو خیالات پیش کئے جاتے ہیں وہ بھی تنقید وتحسین سے ماورا نہیں ہوتے اور نئے فکری زاویوں کے تحت انہیں نئے نئے انداز سے سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ ایک اچھی تحریر کی خوبی ہوتی ہے۔ لیکن تخلیق، تنقید اور تحقیق کی زبان میں فرق ہوتا ہے۔ تحقیق کے الفاظ متعین صورت کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن اگر ایک ہی متن کا کوئی دوسرا Version دریافت ہوجائے یا ایک ہی شعر کی لفظیات میں تبدیلی آجائے تو اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔ مگر ان پہلوؤں کی موجودگی میں جو فیصلہ ہوگا وہ دوسرا ہوگا اور بنیادی متن کے بارے میں جو کچھ کہا جائے گا وہ الگ ہوگا۔ چونکہ لفظ اپنی معنویت کے اعتبار سے جامد نہیں ہوتے مگر اپنی صورت کے اعتبار سے ان کا اپنا حرفی اور صوتی Structure متعین ہوتا ہے۔ اب اس کے معنی موقع محل اور صورت حال کے مطابق اعتباری شکلیں اختیار کرلیتے ہیں جو غیر متعین ہوتی ہیں۔

تانیثیت بطور تحریک کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ادب زندگی کے نشیب وفراز، سماجی تبدیلیوں کے دباؤ اور احتجاج کی آواز رکھتا ہے۔ ادب غیر جانبدار نہیں ہوسکتا۔ سماجی اور آئیڈیولوجیکل موقف ادب کے بین السطور میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

مشرقی تہذیب میں خواتین کے مقام کا مسئلہ ہمیشہ متنازعہ فیہ رہا ہے اردو زبان وادب میں اس کا بیج اگر چہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں اور امراؤ جان ادا میں مل جاتا ہے اس کے علاوہ وہ لوک گیت جو عورتوں کی طرف سے لکھے گئے، بھجن میں بھی بات عورت کی طرف سے کہی جاتی ہے۔ یہاں ان گیتوں اور بھجنوں میں نسائی جذبات واحساسات نسائی لب ولہجے کو بہ خوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن اس طرف آئیڈیولوجیکل توجہ سب سے پہلے ترقی پسندوں کے زمانے میں ہوئی۔ رشید جہاں اور عصمت چغتائی، جیسے فنکاروں نے عورت کے مسائل اور سماجی بے انصافی کے خلاف ادبی طور پر موثر آواز اٹھائی اور اردو حلقوں کو متوجہ کیا۔

مابعد جدیدیت کے تحت 1990ء کے آس پاس اس

نسائی آواز نے تانیثی تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ اور اس طرح خواتین افسانہ نگاراور شاعرات نے اپنی تخلیقات میں اس ظلم وتشدد، سماجی، معاشرتی اور طبقاتی نابرابری کے خلاف آواز اٹھائی جس میں عورت صدیوں سے قید تھی۔مشرقی عورت کے اپنے مسائل ہیں جو یہاں کی جڑوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ انھیں مسائل کو ان تخلیق نگار خواتین نے بڑے دلچسپ اور موثر ڈھنگ سے اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔اس تانیثی ادب سے یہ فائدہ ہوا کہ ایک عام عورت کو بھی اپنے حقوق کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں اوراس نے بھی مرد کے بے جاظلم واستحصال کے خلاف آواز بلند کی۔اس کو یہ بھی احساس ہوا کہ وہ بھی سماج کا اتنا ہی اہم حصہ ہے جتنا کہ مرد۔اس دنیا میں مرد کا وجود ہی عورت سے قائم ہے۔ اس کو پیدا کرنے والی خود عورت ہے۔ وہ بھی اس سماج میں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرسکتی ہے۔ وہ صرف شئے نہیں ہے جس کو استعمال کیا اور کوڑے دان میں پھینک دیا۔اس کا اپنا وجود ہے۔اس کے اپنے جذبات واحساسات ہیں۔جن کو چکنا چور کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہماری بہت سی فکشن نگار خواتین اور شاعرات سامنے آئیں۔جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے آج کی عورت کو ایک آزاد ذہن دیا۔ایسا ذہن جس میں وہ مردوں سے کندھے سے کندھا ملا کر چل رہی ہے۔کوئی میدان ایسا نہیں ہے جس کو عورت نے سر نہیں کیا ہو۔آج وہ کلپنا چاؤلہ بن کر خلا تک کا سفر کر آئی ہے۔ ہندوستان کی وزیر اعظم ہی نہیں صدر بھی منتخب ہوچکی ہے۔اس کو جب جو ذمے داری سپرد کی گئی ہے ہر ذمے داری کو اس نے بہ خوبی نبھایا ہے۔

برصغیر ہندو پاک میں کئی اہم خواتین تخلیق نگار ایسی ہیں جنھوں نے اپنی شاعری اور فکشن کے ذریعے اس تانیثی تحریک کو جلا بخشی ان میں خاص شفیق فاطمہ شعریٰ، نور جہاں ثروت، عذرا پروین، شبنم عشائی۔سیدہ نسرین نقاش، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، فاطمہ حسن، صغریٰ مہدی، صادقہ نواب سحر، غزال ضیغم، شائستہ فاخری، صبیحہ انور، عائشہ صدیقی، ترنم ریاض، تبسم فاطمہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان فنکار خواتین کا جو بھی شعری اور افسانوی سرمایہ ہے اس میں انھوں نے عورت پر ہونے والے ظلم و تشدد کے خلاف کھل کر احتجاج کیا ہے۔ نیز عورت کو ان بے جا بندشوں اور زنجیروں سے آزادی دلانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ صدیوں سے قید ہے۔

اگر ان خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں پر نظر ڈالیں تو ہر افسانہ ایک لڑکی، ایک عورت کی درد بھری کہانی بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ کہانیاں عورت کی بکھرتی ہوئی اور تڑپتی ہوئی زندگی کی عکاس ہیں۔آج اکیسویں صدی میں بھی عورت مرد کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بننے پر مجبور ہے۔ کیوں کہ اس بھری دنیا میں شوہر کے سوا اس کا کوئی سہارا نہیں، وہ جائے تو کہاں جائے۔ کہے تو کس سے کہے اس لئے وہ شوہر کے ہر ظلم کو برداشت کرتی ہے۔ پھر بھی یہ ظالم مرد بیوی کو بچی پیدا کرنے کے جرم میں طلاق کا پرزہ تھما کر ہمیشہ کے لئے گھر سے نکال دیتا ہے۔اس کے مائیکے واپس بھیج دیتا ہے۔ وہاں بھی اس کا کوئی رکھوالا نہیں ہوتا۔انگلیوں پر گنتی کا سفر، میں شائستہ فاخری نے اسی طرف معنی خیز اشارے کئے ہیں۔

''آفاق کی مٹھی میں بند کاغذ نے ثانیہ غفور کے مقدر کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا تنہا ہوگئی''۔

(اداس لمحوں کی کود کلامی، ص:161)

تو یہ ہے ہندوستانی سماج میں عورت کی حالت جہاں اس کا اپنا کوئی تشخص نہیں ہے۔ جہاں اس کی اپنی ذات، اپنی شخصیت بے معنیٰ ہے۔ جہاں وہ مرد کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہے۔مرد کے ہاتھوں ہر ناجائز بات ماننے کے لئے مجبور ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ معاشی طور پر خود مختار نہیں ہے۔

''آپ اس رات مخالفت کرسکتی تھیں جب میں نے صاحب کے کہنے پر غلط عورت کو ان کے کمرے تک پہنچایا تھا۔آپ نے نہ اس کو روکا

نہ مجھے پھٹکارا۔ آپ کی خاموشی سے آپ کی رضا مندی ظاہر ہوتی ہے.....ہم لڑکیوں کی پیدائش والدین کی رضا مندی سے ہوتی ہے اور ہم عمر بھر اس رضا مندی کی قیمت چکاتے رہتے ہیں۔ ان کے ہر حکم پر اپنی رضامندی دے کر خواہ وہ باپ کا گھر ہو یا شوہر کا .....لڑکی خود کو ہر مورچے پر بے بس سمجھتی رہتی ہے ..... ہماری پرورش ہی ایسی کی جاتی ہے''۔

(اداس لمحوں کی خود کلامی، ص161)

سوال یہاں بھی وہی پیدا ہوتا ہے کہ کیا لڑکی کی پیدائش ایک گناہ ہے۔ کیا ایک عورت کو ایک بچی کی ماں بننے کا حق بھی نہیں ہے۔ مرد کو جب بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک لڑکی کا باپ بننے والا ہے وہ فوراً ہسپتال لے جا کر ابارشن کرا دیتا ہے۔ اگر کسی طرح لڑکی پیدا بھی ہو جاتی ہے تو پھر وہ بیوی کو اس گناہ کی سزا طلاق کے روپ میں دیتا ہے لیکن یہاں بھی سوال یہی ہے کہ لڑکی کے پیدا ہونے کی ذمے دار کیا عورت ہے۔ یہ تو قدرت کا نظام ہے کہ اس نے یہ صلاحیت یا طاقت بھی مرد کو دی ہے۔ کہ وہ لڑکا پیدا کرے یا لڑکی۔

جس طرح ہماری بچیوں کا جنسی استحصال ہو رہا ہے اسی عصری دور میں یہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ جیسے جیسے ہمارا معاشرہ آگے کی طرف بڑھ رہا ہے ترقی کر رہا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں یہ سماجی برائیاں بھی جڑ پکڑ رہی ہیں ۔ نہ صرف ان بچیوں کا جنسی استحصال ہو رہا ہے بلکہ اس خوف سے کہ ان درندوں کے نام سامنے نہ آجائیں۔ بڑی بے دردی سے یہ خونخوار جانور ان کی عصمت دری کر کے ان کو موت کے گھاٹ بھی اتار دیتے ہیں۔ اس طرح بڑے مہذب انداز میں ذکیہ مشہدی نے سوالات کھڑے کئے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانے فاختہ میں اس آبرو ریزی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔

دراصل یہ اس لڑکی کی کہانی ہے جو ذہنی طور پر کمزور ہے۔ مرد کی مکاریوں اور چالوں کو سمجھ نہیں پاتی۔ اسے یہ تک بھی نہیں پتہ کہ کسی مرد کے ہاتھوں اس کی آبروریزی کی گئی ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ حاملہ ہو گئی ہے۔

'' منہ کالا۔ ہمارا تو منہ صاف ہے دادی ..... اس کے ہر وقت خوش و خرم رہنے والے ذہن پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ آخر دادی اسے مار کیوں رہی تھیں؟ اور دادی مار رہی تھیں تو اماں کچھ بولتیں، آخر اس نے کیا کیا تھا؟ اسے پھر ابکائی آئی ..... دادی کیوں رو رہی ہو؟

(یہ جہان رنگ و بو، ص:174)

ہمارے سماج میں عورت بھوک اور افلاس سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیتی ہے لیکن اس کے درد کو سمجھنے والا اس کی مدد کرنے والا دور دور تک کوئی نہیں ہوتا۔ عائشہ صدیقی نے اپنے افسانے اجلی صبح کا انجام میں ایسی ہی ایک بے بس عورت کی کہانی بیان کی ہے۔ بھوک سے منی کی ماں کی جان چلی جاتی ہے اور منی اپنی ماں کی موت کا ذمے دار خود کو سمجھتی ہے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے ماں کی جان لے لی ہے۔ منی اس دنیا سے بہت دور چلی جانا چاہتی ہے ایسی دنیا میں جہاں بھوک نہ ہو، جہاں کوئی مانگنے والا ہاتھ نہ ہو افسانہ نگار اس جملے پر اپنی بات کو ختم کر دیتی ہے۔

''کیا دنیا میں ایسا کوئی گوشہ ہے
جہاں بھوک نہ ہو، افلاس نہ ہو؟''

غزال ضیغم نے اپنے افسانوں میں بے باک اور درد مندانہ لہجے میں نسوانی مسائل کو پیش کیا ہے۔ نیک پروین، ان کا بہترین افسانہ ہے۔ عورت مرد کے خاطر تمام قربانیاں دیتی ہے۔ اپنے وجود اپنی ہستی کو اس شوہر کے خاطر نیست و نابود کر دیتی ہے

لیکن یہ مرد اتنا ظالم ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ وفاداری نہیں نبھاتا۔ اس افسانے کا ہیرو بھی کپڑوں کی طرح عورتیں بدلنا چاہتا تھا۔ ایک سے جی بھرنے کے بعد دوسری، تیسری............اس باوفا بیوی کا روحانی کرب دیکھیے

’’ میں نے کیا نہیں کیا اس کو خوش
کرنے کے لیے...... گرمی کی تپتی دوپہروں
میں گیس ختم ہونے پر اس کے لیے جلتے آنگن
میں کاغذ جلا کر چائے بنائی۔ سرد راتوں میں
اس کو بھوک لگنے پر کھانا پکایا، اس کو اپنے
ہاتھوں سے کھلایا، بچوں کی طرح نوالے بنا بنا
کر کھلایا۔‘‘

اس طرح ان خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے نہ صرف عورت کو مرد کے بے جا ظلم و تشدد سے آزادی دلانے کی کوشش کی بلکہ اسمیں ایسی خود اعتمادی بھی پیدا کی جن کے ذریعے نہ صرف وہ تعلیم یافتہ ہوئی بلکہ اس نے زندگی کے ہر شعبے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ اسی طرح ہماری خواتین شاعرات نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے عورت کو آگے بڑھانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ یہ خواتین شاعرات اپنے مقصد میں کہیں زیادہ کامیاب نظر آتی ہیں کیونکہ شاعری دلوں کو زیادہ جلدی متاثر کرتی ہے اور اس کا تاثر دیر تک قائم رہتا ہے۔

ہندوستان کے شعری منظر نامے میں تانیثی تحریک جس طرح ابھر کر سامنے آئی ان میں عذرا پروین کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعے عورت کے درد و کرب اور اس کے ساتھ ہونے والا ظلم و تشدد اور جنسی استحصال کو جس طرح پیش کیا ہے وہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

جہاں چاہا وہیں رکھا، نہیں چاہا نہیں رکھا
کبھی صید فلک رکھا، کبھی زیر زمیں رکھا
(راگ راگ مٹی، صفحہ:46)

مرد جس طرح چاہے عورت کا استعمال کرتا ہے جب تک چاہتا ہے اس کو اپنے گھر میں رکھتا ہے اور جب اس کا دل بھر جاتا ہے تو اس کو گھر سے باہر نکال کر کھڑا کر دیتا ہے۔ عذرا کی شاعری میں عورت پر ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کی لے صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی شاعری میں جو نسوانی جیت موجود ہے وہ انھوں نے کسی سے مستعار نہیں لی بلکہ یہ ان کا اپنا روحانی کرب ہے جس سے وہ تا زندگی گزرتی رہیں۔ ان کی ایک نظم ہے ’’سپلائر‘‘ اسکو انھوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے حصے میں عذرا نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے بھی لوگ بیٹیوں کو زمین کے نیچے دفن کر دیا کرتے تھے آج بھی اتنا لمبا عرصہ گزر جانے کے بعد صورت حال نہیں بدلی صرف سرزمین بدل گئی۔ دور حاضر میں بھی بچیوں کو جہیز کی مانگ پوری نہ ہونے پر زندہ جلایا جا رہا ہے۔ اسکے علاوہ ان کو بے آبرو کر کے قتل بھی کیا جا رہا ہے اگر ان مومنوں، سے پوچھا جائے کہ ان بیٹیوں کے لے کیا حکم ہے تو وہ پھر قرآن پاک کا ایسا فرمان بیان کر دیں گے جو صدیوں سے ان کے ذہنوں میں موجود ہے۔ اور اس طرح وہ سماج کو تسلیمہ نسرین جیسی عورتیں سپلائی کر رہے ہیں۔ اور خود مومن، ہونے کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں۔ یہاں شاعرہ کا کہنا یہ ہے کہ عورت کو سماج کی طرف سے نہ شریعت کی طرف سے کوئی انصاف ملتا ہے۔ یہ مومن، خود اپنے مفاد کے لئے خدا کے احکام کو بھی توڑ مڑوڑ کر پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے مطابق عورت کو جتنا دبایا اور کچلا جائے اتنا ہی بہتر ہے، اور آدمی (مومن) ہر طرح سے پاک، صاف ہے اس کا ہر گناہ قابل معافی ہے۔ اور ان کے نزدیک بے گناہ عورت بھی قصوروار ہے۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں انھیں کی اجارہ داری چلتی ہے۔

مرد، ہمیشہ عورت کی اصلاح کی بات کرتے ہیں، اپنی ہر تبلیغ میں عورت ہی ان کا موضوع ہوتی ہے عورت کے لیے تمام احکام خداوندی بھی ہیں، فتوے اور سزائیں بھی، اور جن مردوں کی

وجہ سے عورت بگڑی ہے یہ سماج اور معاشرہ جس میں بہت سی برائیاں پیدا ہو چکی ہیں ان خرابیوں کو پیدا کرنے والے کے لیے کوئی سزا نہیں، سزا تو صرف عورت کے لئے ہے۔عورتوں پر لکشمن ریکھائیں مقرر کر دی ہیں اور خود ان کے سپلائر بن گئے۔افغانستان سے ہندوستان تک ان لکشمن ریکھاؤں کے سپلائر پھیلے ہوئے ہیں۔لیکن ان سپلائروں کے لئے کوئی سزا مقرر نہیں......

'میں جا رہی ہوں' میں عذرا نے ایک طلاق شدہ عورت کا درد بیان کیا ہے اس کے لیے تمام دروازے بند ہو گئے ہیں۔شوہر نے اسکو طلاق دیدی، اور وہ ماں جس نے بڑے لاڈ و پیار سے اس کی پرورش کی تھی اس نے بھی اس بیٹی کو گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا۔ یہ مجبور اور بے بس لڑکی کس کی پناہ میں جائے۔اس کے لیے کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں جا کر وہ سر چھپائے۔اپنی ماں سے شکایت کر رہی ہے۔

''...... یہ بدلا بدلا سا رنگ ہے کیوں ؟/تمہارا
ہی ٹوٹا انگ ہوں میں/مجھے سمیٹو تمہارا ہی رنگ
ہوں میں/کٹھور ماں تجھ میں ایک پرانی سی
ماں/کیسے جا کے کھو گئی ہے اسے بتا دو/کہ آج
میں ڈری سی بس/ایک تحفظ کی گرم چادر تمہاری
قربت میں/ڈھونڈتی تھی۔''

(بارہ قباؤں کی سہیلی،صفحہ:155)

انھوں نے اپنی نظموں میں عورت پر ہونے والی ناانصافیوں پر پردہ نہیں ڈالا بلکہ ایک عورت شبنم عشائی کی شاعری نے بھی تانیثی تحریک کو آگے بڑھانے میں کافی مدد کی۔عورت میں بے جا تشدد کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔مرد آج اکیسویں صدی میں بھی جس طرح عورت پر حکم صادر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی چھین لیتا ہے۔صرف عورت کے بدن کو ہی نہیں بلکہ اس کی روح تک کو بھی زخمی کر دیتا ہے۔اسکے دل و دماغ پر ایسی ضرب لگا تا ہے۔کہ وہ اپنے وجود تک کو فراموش کر دیتی ہے۔

''میں گھر سے/کسی دوسرے کی نہیں/بلکہ اپنی
تلاش میں نکلی تھی/اور تمہارا/ہر سبق تمہارے
بارے میں تھا/تم نے میری آنکھوں میں/
چاندی کے سکوں کا کاجل لگایا/تا کہ میں دیکھ
نہ سکوں آسمان کو چھوتے ہوئے/
/لامحدود راستوں کو/تم نے اپنے وجود کی/ساری
کڑواہٹوں کو نچوڑ کر/میرا گلاس بھر دیا/ اور اس
کڑوے رس کو پی کے/میں/نہ صرف اڑنے کی
چاہت/بلکہ اپنی ذات بھی بھول گئی/لیکن اب/
جو میری فیصلہ کرنے کی صلاحیت/مجھ سے چھین
رہے ہو/یہ جو جلتے ہوئے پتوں کے دھوئیں سے
/مجھے ڈھک رہے ہو/دیکھو/ تمہارا کمرہ مجھ پر
اختیار کی/مصنوعی روشنی میں چمک رہا ہے/اور
میرے ذہن کی روشنی/بجھ رہی ہے۔''

(من بانی،صفحہ 26-28)

یہاں عورت کے اس درد کو بیان کیا ہے، جسکو وہ تا زندگی برداشت کرتی ہے۔ اسکے آگے بڑھنے کی ہر قوّت کو پائمال کر دیا جاتا ہے۔مرد ہمیشہ اس بات سے خوف زدہ رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عورت اپنی ذہانت کا استعمال کرتے ہوئے مجھ سے آگے نکل جائے۔اور پھر یہ دنیا اسی کے چاروں طرف گھومے۔اور یہاں آسمان کی بلندیوں پر پہنچ جائے۔اسی لئے وہ اس کی پرواز کے تمام راستے بند کر دیتا ہے۔یہاں تک اس کے پر بھی کاٹ دیتا ہے۔تا کہ وہ اُڑنا بھول جائے۔شبنم فلسفہ کی طالبہ رہی ہیں۔ اس لئے انھوں نے سماج کے اس طبقے پر ہونے والی ناانصافیوں کو بھی فلسفیانہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ اسی لیے شاید انھوں نے عورت کے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

'' ایک بے خوابی کا صحرا ہے/سناٹے جھانکتے

پھانکتے/ٹوٹ کر/بکھر جاتی ہوں/ہر رات/
پلاسٹر آف پیرس کی/سفید تہہ/خود پہ چڑھا لیتی
ہوں/اور جب/صبح ہوتی ہے/تو/بستر پر/ایک
لکیر پاتی ہوں/جس کا تسلسل/ہزار خانوں
میں بٹ کر بھی/باقی رہتا ہے''

(من بانی، صفحہ:222)

شبنم نے تانیثی حسیت کو جس طرح اپنی شاعری میں پیش کیا ہے اس نے نہ صرف تانیثی تحریک کو جلا بخشی بلکہ عصری دور کی عورت کے ذہنی دریچوں کو بھی وا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو اپنا قوّت ارادی کو مضبوط رکھنا چاہیے۔ پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ ان کی بھی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے جو عورت کی آزادی اور اسکے وجود کو مسلب کر رہی ہے۔

پاکستان میں بھی بہت سی خواتین شاعرات ہیں جنھوں نے تانیثی تحریک کو پروان چڑھانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ یہاں چند شاعرات کا ذکر ہی ممکن ہے۔ پروین شاکر ہمارے شعر وادب کی وہ شاعرہ ہیں جنھوں نے بڑی بے باکی اور شعری حسیت کے ساتھ اس تانیثی تحریک کو ایک اسالیب حوصلہ عطا کیا جس سے اسکے تمام راستے وا ہو گئے۔اور ایک جست لگاتے ہی یہ تحریک کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔آج اکیسویں صدی میں بھی ہمارے سماج میں لڑکی کی پیدائش ناقابل تلافی جرم ہے کیونکہ لڑکی بڑی ہوگی تو اسکو جہیز دینا پڑے گا۔اس مہنگائی کے دور میں لاکھوں کروڑوں کا جہیز کہاں سے دیا جائیگا۔اسلئے بہتر یہی ہے کہ بچیوں کو رحم مادر میں ہی مار دیا جائے۔اپنے خیالات کا اظہار پروین شاکر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''......اور میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک ایسے قبیلے
میں پیداہوئی سوچ رکھنا جرائم میں شامل
ہے۔مگر قبیلے والوں سے بھول یہ ہوئی کہ
انھوں نے مجھے پیداہوتے ہی زمین میں نہیں
گاڑا اور اب مجھے دیوار میں چن دینا ان کے لئے
اخلاقی طور پر اتنا آسان نہیں رہا مگر وہ اپنی بھول
سے بے خبر نہیں، سو اب میں ہوں اور ہونے کی
مجبوری کا یہ اندھا کنواں جس کے گرد
گھومتے گھومتے میرے پاؤں پتھر کے ہو گئے
اور آنکھیں پانی کی...... کیونکہ میں نے اور
لڑکیوں کی طرح کھوپے پہننے سے انکار کر
دیا تھا اور انکار کرنے والوں کا انجام کبھی اچھا
نہیں ہوا!''

(صد برگ، رزق ہوا، صفحہ 13)

پروین نے اپنی نظم نکِ نیم' میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ عورت مرد کے ہاتھوں کھلونا بن گئی ہے۔گڑیا کو یہاں استعارہ بنا کر پیش کیا ہے جس طرح گڑیا کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا وہ بے جان شے ہوتی ہے اسی طرح مرد، عورت کو بھی گڑیا سمجھتا ہے۔

''تم مجھ کو گڑیا سمجھتے ہو/ٹھیک ہی کہتے ہو......
!/ ......جب چاہے بینائی لے لو/ یا میری
گویائی لے لو/ مانگ بھرو، سیندور لگاؤ/
پیار کرو، آنکھ میں بساؤ/اور جب دل بھر جائے
تو/دل سے اٹھا کے طاق پر رکھ دو......''

(صد برگ، صفحہ 78-77)

یہاں شاعرہ نے عورت کی اس بیچارگی کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں عورت صدیوں سے قید ہے۔لیکن عورت کا اپنا وجود اس بیجان گڑیا کے مانند ہے جسکی اپنی کوئی حقیقت نہیں، اپنی کوئی مرضی نہیں بس وہ صرف بے جان گڑیا کی طرح مرد کے اشاروں پر ناچنا جانتی ہے اس کے باوجود یہ مرد اس سے کبھی محبت نہیں کرتا اور جب وہ عورت اسکی آسائشوں کا سامان مہیا نہیں کرتی

تو یہ مرد اس کو اس گھر کے ایک کونے میں بے جان کھلونے کی طرح سجا دیتا ہے۔ مرد کے سامنے عورت صرف ایک ایسی بے جان گڑیا ہے جس کے نہ اپنے جذبات ہیں نہ احساسات بس وہ جب تک ہی اس کا ساتھ دیتا ہے۔ جب تک وہ کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پر ناچتی ہے۔

ایک عورت جس کو اس جہاں میں
دنیا کی تمام آسائشیں نصیب ہو جاتی ہیں لیکن
اسکے باوجود وہ خوش نہیں رہ پاتی کیونکہ اس کو
ذہنی آزادی اور آسودگی نہیں حاصل ہوتی۔ وہ
مرد کی بنائی ہوئی زنجیروں میں کچھ اس طرح
قید ہے کہ وہاں سے باہر نکلنے کے تمام راستے
مسدود ہو چکے ہیں۔ ''پھولوں اور کتابوں سے
آراستہ گھر ہے/تن کی ہر آسائش دینے والا
ساتھی/آنکھوں کو ٹھنڈک پہچانے والا بچہ/لیکن
اس آسائش، اس ٹھنڈک کے رنگ عمل میں/
جہاں کہیں جاتی ہوں/ بنیادوں میں بے
حد گہری بے چینی ہوتی/اک آواز برابر گریہ
کرتی ہے/مجھے نکالو/مجھے نکالو''
(ایک دفنائی ہوئی آواز، انکار، صفحہ:35)

پروین شاکر کی شاعری پر شروع سے آخر تک ایک گہری نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ عورت ان کی شاعری کا محور ہے جس کے چاروں طرف ان کی شاعری طواف کرتی ہے انھوں نے جس خلوص اور سچائی کے ساتھ عورت کے جذبات اور احساسات کو اپنے شعری تخیل میں پیوست کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ شاعرہ نے عورت کے جس کرب کا ذکر بار بار کیا ہے اس کرب سے وہ زندگی بھر گزرتی رہیں جس محبت اور چاہت کی وہ متلاشی تھیں وہ ان کو نصیب نہیں ہو سکی اور اسی درد و کرب میں وہ زندگی بھر تڑپتی رہیں، لیکن ان کو کبھی وہ مسرت اور انبساط نصیب نہیں ہو سکا جس کے لئے ان کی روح سرگرداں تھی۔

پروین کی شاعری میں جو ایک کسک، تڑپ اور اضطرابی کیفیت ملتی ہے وہ انہیں حالات کا نتیجہ ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات کی شدت تو ضرور ہے لیکن وہ کہیں بھی اپنے قاری کو مایوسی کی طرف نہیں لے کر جاتیں۔ پروین کی شاعری قاری کے احساسات کو فرحت بخشتی ہے۔

ان اشعار میں تانیثی لب و لہجہ، تانیثی زبان نیز تانیثی لفظیات کو بہ خوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ تانیثی تحریک میں پروین شاکر کی شاعری نے ایک نئی روح پھونکی ہے۔

وہ ایک رشتہ بے نام بھی نہیں لیکن
میں اب بھی اس کے اشاروں پر سر جھکاؤں گی
جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبت کا
وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس کو بھول جاؤں گی
(خوشبو، ص:213)

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں بھی تانیثی فکر کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے عورتوں پر ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف کھل کر احتجاج کیا ہے،۔ انہوں نے کبھی بھی سماجی ٹھیکیداروں کے سامنے اپنا سر نہیں جھکایا۔ جس کی وجہ سے ان کو بدنام بھی بہت کیا گیا۔ ان کا لب و لہجہ بے باکانہ ہے اور کہیں کہیں باغیانہ بھی ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے جذبات و احساسات کا اپنی نظموں میں کھل کر کرتی ہیں۔ اپنی انا اور خودداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں، انہیں اس بات کا احساس بھی ہے کہ مرد کسی بھی عورت سے اسی وقت تک محبت کرتا ہے جب تک وہ حسین اور جوان رہتی ہے۔

''کب تک مجھ سے پیار کرو گے/ کب تک؟/
جب تک میرے رحم سے بچے کی تخلیق کا خون
بہے گا/جب میرا رنگ ہے تازہ/جب تک میرا
انگ تنا ہے/پر اس سے آگے بھی تو بہت کچھ
ہے وہ سب کیا ہے/کسے پتہ ہے/

وہیں کی ایک مسافر میں بھی /
انجانے کا شوق بڑا ہے / پر تم میرے ساتھ نہ
ہوگے / تب تک''

(کب تک، بدن دریدہ، ص56)

فہمیدہ نے اپنی شاعری میں کھل کر ان بندشوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جن میں ہمارے سماج کی عورت صدیوں سے قید تھی۔ اس لیے انہوں نے بدن دریدہ کے پیش لفظ میں اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

''کارگاہِ ہستی میں کس حساس ذی
روح پر وہ مقام نہیں آیا ہوگا جب اس نے خود کو
مقتل کے دروازے پر نہ پایا ہو۔ جب اسے
اپنے وجود کی قیمت نقد جاں سے نہ چکانی پڑی
ہو۔ لیکن جب جان سے ہی گزرنا ہی ٹھہرا تو سر
جھکا کر کیوں جائیں۔ کیوں نہ اس مقتل کو رزم
گاہ بنا دیں۔ آخری سانس تک جنگ کریں۔
سو میں نے بھی اپنی گردن جھکی ہوئی نہیں
پائی.....۔''

(ص:15)

فہمیدہ ریاض کی طرح کشور ناہید بھی ہندوستان کی ریاست اتر پردیش سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعد میں ہجرت کر کے یہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان جا بسیں۔

کشور ناہید بھی تا زندگی عورت پر ہونے والے ظلم وستم کے خلاف احتجاج کرتی رہیں۔ ان کی احتجاج کی لے باغیانہ ہونے کے ساتھ کہیں کہیں جارحانہ بھی ہو جاتی ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسی مظلوم عورت کی کہانی ہے جو بچپن اور نو جوانی میں اپنے والدین کے حکم کی پابند ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی پردے اور گھر کی چہار دیواری میں قید رہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس کے بعد ناسازگار حالات میں شادی ہو کر گھر چلی جاتی ہے اور وہاں سسرال والوں کے ساتھ شوہر کے ظلم وستم کا شکار ہوتی ہے۔ کشور کسی بھی بڑی سے بڑی ہستی کے سامنے اپنا سر نہیں جھکاتیں۔ وہ اپنی انا، خودداری اور تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے بڑی سے بڑی چٹان سے ٹکرا جاتی ہیں لیکن اپنی عزت نفس پر آنچ نہیں آنے دیتیں۔

مرد شادی کرنے کے بعد عورت کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ مرد اس کو ایسی شئے سمجھتا ہے جو مہر کے عوض نیلام ہو کر اس کے گھر آ گئی ہے اس لئے اس کو ہر طرح سے استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

''موت کا ذائقہ / لفظوں کے پیکر میں / اس
کے ہونٹوں سے ٹپکتا ہے / وہ نفرتوں کو بوسوں کا
رنگ دے کر / میرے منہ پر نیلے نیلے داغ
ڈال کر / یہ جتانا چاہتا ہے / کہ اسے میرے جسم
کو ہر طرح استعمال کرنے کا حق ہے / یہ حق بھی
کیا عجیب ہوتا ہے / حق جتانے کی خواہش /
محکومیت کی ڈھال پہ اپنا چھتر بناتی ہے۔''

(نیلام گھر، ص:27)

کشور ناہید عورت کے درد و کرب میں برابر کی شریک ہیں۔ نسوانی حسیت کو انہوں نے ہر زاویہ نگاہ سے محسوس کیا ہے اور اس کو اپنی شاعری میں اس طرح شامل کیا ہے کہ وہ ایک عام عورت کا درد و کرب بن کر ابھرتا ہے۔ ایک اور نظم میں انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے التجا کی ہے کہ اس مرد کے کردار کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ عورت پر کھلے عام ظلم وستم ہو، مرد حضرات شرابی بن جائیں۔ چاروں طرف انسان کا خون بہایا جائے۔ یہ سماج کے ٹھیکیدار اپنی زبان نہیں کھولیں گے۔ لیکن اگر کوئی عورت اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتی ہے تو فوراً اس کو دائرہ اسلام سے خارج کر کے اس کو زندگی کے ہر سکھ سے محروم کر دیا جائے گا۔

''انہیں عورت سے نفرت ہے / گویا انہیں اپنی
ماں اور اپنی بیٹی سے نفرت ہے / وہ عورت کی

ہر شکل میں شہوت دیکھتے ہیں / اور یوں اپنے
خوابوں کو آراستہ کرتے ہیں / دنیا پہ کوئی
مصیبت آجائے / وہ نہیں بولیں گے / سارے
ملک کے سارے افسر / راشی ،شرابی اور بد
کردار ہوجائیں / وہ نہیں بولیں گے / ہر ہر قدم
پر گلے کاٹے جائیں / وہ نہیں بولیں گے / ہاں
کوئی عورت ہاتھ میں علم لے کر نکلے / فوراً
بولیں گے / فوراً خارج کر دیں گے دائرۂ
اسلام سے / زندگی کے ہر انعام سے''

(اے میری قوم میری بنتی سن،ص:22-21)

کشور ناہید نے اپنی شاعری کے ذریعے کوشش کی ہے کہ عورت اور مرد دونوں کے ذہنوں کو بدلا جائے تا کہ اس سماج میں رہنے والی عورت کے ساتھ انصاف ہو سکے۔ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ یہ تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب مرد حضرات بھی اپنی سوچ بدلیں۔ نیز عورت کو تو اپنی عزت نفس، اپنی خودداری، اپنے ساتھ انصاف حاصل کرنے کے لیے اس لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہوگا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری خواتین افسانہ نگار اور شاعرات نے اپنی تخلیقات کے ذریعے ایک عام عورت میں خود اعتمادی پیدا کر کے اس کو اس قابل بنایا کہ اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کے خلاف آواز بلند سکے۔ اس کو یہ بھی احساس دلایا گیا کہ وہ انسان ہے۔ کوئی ایسی شئے نہیں ہے جس کو جب تک چاہا استعمال کیا اور بعد میں کوڑے کے ڈھیر میں مرنے کے لیے پھینک دیا گیا۔ بلکہ وہ بھی برابری کا درجہ رکھتی ہے۔ ہر لحاظ سے مرد کے برابر ہے۔ اپنے گھر، بچوں، جائیداد، پر اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مردوں کا۔ وہ بھی تمام اہم فیصلے لینے کے لیے خود مختار ہے جتنا کہ مرد۔ اس طرح تانیثی تحریک نے صرف اردو شعر و ادب میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں، کنڑ، ملیالم، تیلگو، ہندی، بنگلہ، وغیرہ میں بھی عورت پر ہونے والے ظلم و استحصال کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اور ان کے نتائج بھی خوش آئند رہے۔ آج ہندوستانی عورت نہ صرف تعلیم یافتہ ہو رہی ہے بلکہ ہر شعبے میں مرد کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہی ہے۔ یہ ایک ایسی بڑی تبدیلی ہے جس کے نتائج دور رس ہوں گے۔ لیکن ابھی ہندوستان کے گاؤں اور دیہات کی عورت اس طرح Aware نہیں ہوئی ہے کہ وہ اپنے حقوق کا استعمال بجا طور پر کر سکے۔ ابھی ہماری خواتین تخلیق نگاروں کو ان تک پہونچنے کے لیے مزید محنت و مشقت کی ضرورت ہے۔ یہاں چند ہی تخلیق نگار خواتین کا ذکر ممکن ہوسکا۔ چوتھے باب میں ان کی تخلیقات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

مابعد جدیدیت کا مرکزی ایجنڈا ادبی شرائط کے لحاظ کرتے ہوئے سماجی و ثقافتی سروکار ہے۔ تانیثیت ان سماجی سرو کاروں میں مرکزی مسئلہ اس لیے ہے کہ اس کا تعلق دنیا کی نصف آبادی سے ہے، بلکہ آنے والی نسلوں اور نوجوانوں سے بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تانیثیت بنی نوع انسان کے بہتر مستقبل کی بشارت کرتی ہے۔

OOO

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔

☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔

☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔

☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔

☆ اپنے مضامین اور تخلیقات

"idarasabras@yahoo.in" پر بھیج سکتے ہیں۔

مضمون

تنویر حسن

دیوان والہ داغستانی کے اہم قلمی نسخوں کا تعارف

مخطوطات نہ صرف ملک کا عظیم قومی سرمایہ ہیں بلکہ مشترکہ تہذیب، ثقافت اور ادب کے نا قابل تردید ثبوت ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری علمی، ادبی، تہذیبی اور تاریخی زندگی کا بھی نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ اگر ہم نے ان پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کی تو ہم ماضی سے کٹ جائیں گئے اور ہماری شناخت ختم ہو جائے گی چونکہ ہمارے ملک کی تاریخ فقط قلمی نسخوں میں محفوظ ہے۔ پیش نظر مقالہ میں بھی ایک پر ارزش اور نادر دیوان کا تعارف اس کے قلمی نسخوں کے حوالے سے منظر عام پر لانے کی سعی کی جارہی ہے۔ دیوان والہ داغستانی کے جن قلمی نسخوں کا ذکر ذیل میں ہوگا ان میں سے بیشتر راقم الحروف نے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں دیکھے ہیں اور چند کی اطلاعات فہرست مخطوطات سے حاصل کی گئی ہے۔ اس سے قبل کہ دیوان والہ داغستانی کے قلمی نسخوں کا تعارف پیش کیا جائے مناسب ہے کہ ان کے مختصر احوال بیان کیے جائیں۔

علی قلی نام اور والہ تخلص اگر چہ ان کی ولادت یکم صفر 1124 ہجری میں بمقام اصفہان کے ایک نامور ومعزز خاندان میں ہوئی لیکن وہ والہ داغستانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ والہ نے ''ریاض الشعرا'' میں لکھا ہے کہ فتنہ ہلاکو خان کے زمانے میں اور عباسیوں کی زوال سلطنت کے وقت ان کے اجداد ''داغستان'' پہنچے اسے وجہ سے وہ ''والہ داغستانی'' کہلائے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت عباسؓ سے جا ملتا ہے جس کا اظہار انہوں نے ذیل شعر میں بھی کیا ہے:

دارد ز زلف کسوت عباسیان ببر
از دودمان ما ست رخ دلستان ما

والہ داغستانی کی عمر ابھی پانچ سال کی تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا اس کے بعد وہ اکثر اپنے چچا حسن علی خان کے گھر رہتے اور اپنی نامزد خدیجہ سلطان کے ساتھ وقت گذارتے تھے۔ خدیجہ سلطان حسن علی خان کی بیٹی اور والہ داغستانی کی چچازاد بہن تھی۔ والہ داغستانی کی فرمایش پر فقیر دہلوی نے 1160 ہجری میں مثنوی والہ وسلطان نظم کی، جس سے والہ داغستانی کے احوال پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے اور ان کے دوستانہ روابط کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مثنوی والہ کی زندگی میں ہی قلم بند کی گئی۔ اس لیے دوسروں تذکروں کے مقابلے میں مذکورہ مثنوی زیادہ مستند اور قابل اعتماد ہے۔ صاحب تذکرہ ''مخزن الغرائب'' کا بیان ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

''بمیر شمس الدّین و علی قلی
خان والہ نهایت فرط محبت و
واسطہ هم قومی درمیان بوده تا
وقتی کہ همدگر را نمی دیدند
آرام و قرار نداشتند و مثنوی والہ
و سلطان نام بموجب فرمایش
خان مزبور میر شمس الدّین
برشتہ نظم کشیده۔''

والہ داغستانی کے ذیل اشعار سے ان کے اور خدیجہ سلطان کے عاشقانہ تعلقات ظاہر ہوتے ہیں:

عمریست بسی مانده از کوی
خدیجہ بادی برسانید بمن بوی
خدیجهچه پرسی برای کہ دیوانہ
گشتمبرای خدیجہ برای خدیجہ

بلاشبہ خدیجہ سلطان کو بھی والہ داغستانی سے والہانہ عشق تھا۔ وہ بھی شعری ذوق کی مالک تھی اور اس نے ذیل کی رباعی میں اپنے عشق کا

اظہاراس طرح کیاہے:

افسانۂ درد من اگر گوش کنی
از لیلٰی و داستانش خاموش کنی
در قصّۂ عشق این عم شنوی
مجنون و حکایتش فراموش کنی

بھگوان داس ہندی نے لکھا ہے کہ ''مرزا محمد منشی'' والہ کے استاد تھے جو فقہ، حدیث، حکمت، تصوف، رمل، حساب اور موسیقی میں عالم و ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی، شوخ طبع اور رنگین صحبت میں بھی مشہور تھے۔ والہؔ داغستانی کے ذیل بیان سے بھی تصدیق ہوجاتی ہے:

'' راقم حروف در خدمت آن مرحوم تربیت شدہ۔ چند گاہ معلم فقیر بودہ۔ بعضی کتب را در خدمت ایشان مطالعہ نمودہ و مشق نسخ تعلیق نیز در خدمت آن مرحوم کردہ۔ کلیات نوایی و چند رسالۂ معما نیز در خدمت ایشان خواندہ۔ الحق آن قدر ها حق تربیت و نوازش به این نا چیز دارد که به شرح در نمی آید۔''

والہؔ داغستانی 1147 ہجری میں دہلی وارد ہوئے اور اپنی ملازمت کے سلسلے میں زندگی کے آخری ایام تک دہلی میں رہے۔ انجام کار انہوں نے 1169 ہجری میں بمقام دہلی وفات پائی۔ وہ ایک عاشق دلفگار اور ممتاز شاعر تھے۔ درحقیقت عشق ہی نے انھیں شاعر بنایا اور ان کے اشعار میں سوز و گداز پیدا کیا۔ صاحب تذکرہ ''سفینۂ خوشگو'' ان کی تعریف و توصیف اس طرح کرتے ہیں:

'' شاعر خوش سلیقه زبان
دانست و او از شعرائی
هنگامه ساز است۔''

والہؔ داغستانی کی تالیفات میں دیوان شامل ہے، جس کی جمع آوری میر شمس الدّین فقیر نے کی۔ دوسری تصنیف ''مثنوی میرزا نامہ'' داستان عشق میرزا شیرافگن اور ''نجم الہدیٰ'' ایک مذہبی اور عرفانی تصنیف ہے۔

''بیاض والہ'' اور اس کے علاوہ تذکرہ ''ریاض الشعرا'' جس میں تقریباً پچیس سو متقدم و متاخرین شعراء کا ذکر ہے اور تقریباً چالیس ہزار ابیات شامل ہیں۔ یہ تذکرہ اس دور کے اہم ترین تذکروں میں سے ایک ہے جس سے خصوصاً اس عہد کے فارسی شعراء کے حالات پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ خان آرزؔو کو اپنا تذکرہ مجمع النفائس کی تکمیل کے بعد ریاض الشعرا کے مطالعہ کا موقع فراہم ہوا تو انھوں نے والہؔ داغستانی کی علمیت و عظمت کا اعتراف کیا ہے:

'' بعد از نوشتن این نسخه، تذکرۂ مذکور به نظر آمد و الّا این همه درد سر نمی کشید۔''

01۔ دیوان والہ داغستانی کا نسخہ مملوکہ رضا لائبریری، رام پور میں موجود ہے جس کا کیٹلاگ نمبر 3703 ہے۔ یہ نسخہ خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ کاتب کا نام ''محمد رفیع'' ہے۔ نیز تاریخ کتابت ''1163'' ہجری ہے۔ دیوان 414 صفحات پر مشتمل ہے۔ جبکہ ہر صفحہ پر 08 سطری ہے۔ نسخہ کا سایز: 07×11:11×18 سم ہے۔ نسخہ مجدول ہے، جدول مطلّا ہے۔ دیوان اگرچہ جا بجا کرم خوردہ ہے لیکن پڑھنے میں بالکل صاف، خوش خط اور واضح ہے۔ اس کے اولین صفحہ پر رقم ہے: ''یك صفۂ اول کم'' اسی ورق پر ''کتب خانہ ریاست رامپور'' کی مہر ثبت ہے۔ اس نسخہ کی شروعات ذیل کے بیت سے ہوئی ہے:

گردیده چرخ چهره بما غالباً که
نیستط هماسپ شاه سرو گردون لام ما

یہ نسخہ غزلیات سے شروع ہوا ہے۔ پہلی غزل کے پانچ اشعار غائب ہیں جو دوسروں نسخوں میں شامل ہیں۔ راقم الحروف کا

خیال ہے کہ یہ نسخہ ناقص ہے اور اس کے بہت سے اوراق ضایع ہو گئے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا میں لازمی سمجھتا ہوں کہ یہ نسخہ دیگر نسخوں سے قدیم اور ضخیم ہے۔ اس کی کتابت بھی شاعر کی حیات میں ہوئی ہے۔ اس کے آخر میں ذیل کی عبارت تحریر ہے۔

''این نسخه دیوان علی قلی خان
واله سلمه الرحمن فی 1143
هجری من هجرة النبی صلی الله
علیه وسلم بدستخط محمد رفیع با
تمام رسید''

آخر میں بھی ''کتب خانہ ریاست رامپور'' کی مہر ہے۔ ذیل کی رباعی پر اس نسخہ کا خاتمہ ہوا ہے:

چیست آن مادر زاید بچّه
همچو دُر صاف و خوش و روشن
ضمیرباز آن بچّه چو آبستن شود
مادر خود را بزاید همچو قیر

اس نسخہ کے شروع میں قصائد بھی رہے ہوں گے لیکن شروع کے اوراق ضائع ہونے کی وجہ سے قصائد بھی ضائع ہو گے ہوں گئے۔ دوسرے نسخوں کے ساتھ ساتھ ریاض الشعرا میں بھی کئی قصائد شامل ہیں۔

مذکورہ دیوان 303 غزلیات، 03 مثنویات، مقطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ غزلیات کے اشعار کی تعداد 827، رباعیات اور مقطعات کے اشعار کی تعداد 1037 ہے۔ 206 ،اشعار پر مشتمل پہلی مثنوی خدیجہ سلطان کی مدح میں بطور مکتوب ہے۔ والہ داغستانی نے اس منظوم مکتوب کو خدیجہ سلطان کے لیے اصفہان بھیجا تھا۔ اس منظوم مکتوب کو فقیر دہلوی نے اپنی مثنوی ''والہ و سلطان'' میں نقل کیا ہے۔ یہ مثنوی والہ و سلطان میں ذیل عنوان سے ہے:

''سواد نامه که واله در مکتوب
خدیجه سلطان بیگم بنظم آورده و
خوان فصاحت بجهته ضیافت
طبع سخن سنجان گسترده''

دوسری مثنوی تینتیس اور تیسری مثنوی تیس اشعار پر مشتمل ہے۔

02۔ مملوکہ رضا لائبریری، رام پور میں کیٹلاگ نمبر 3704 کے تحت دیوان والہ داغستانی کا نسخہ خط نستعلیق میں 271، اوراق پر مشتمل ہے جس میں سن کتابت اور کاتب کا نام مرقوم نہیں ہے، ہر ورق پر 14 مسطر شامل ہیں۔ اس کا سایز: 08× 13.5: 15.5×24 سم ہے۔ نسخہ مجدول ہے، جدول سرخ و کالا ہے۔ دیوان پڑھنے میں بالکل صاف ہے۔ اس نسخہ کے اولین ورق پر ''کتب خانہ ریاست رامپور'' کی مہر ثبت ہے۔ ورق 34 پر ذیل کی عبارت رقم ہے:

''در کتابخانه سلمه سلطان بیگم
متخلص به مخفی از محلّات
معلّای حضرت عرش آشیانی
1015قمری داخل گردید در
تحویل فاضل خان''

مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ نسخہ 1015 قمری یا اس سے قبل کا لکھا ہوا ہے لیکن والہ داغستانی کی ولادت 1124 ہجری ہے۔ اس لیے یہ بیان غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس نسخہ کی قدامت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کی حیات میں لکھا گیا ہوگا۔ تحریر بالا کسی نے محض اس نسخہ کی قدامت ثابت کرنے کے لیے لکھ دی ہے لیکن اس کو شاعر کے سال ولادت سے آشنائی نہیں تھی۔ ورق 35 پر ''شاہ عالم بادشاہ غازی غفنفر خانہ زاد سنہ احد 1190'' کی مہر ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ نسخہ شاہ عالم بادشاہ کی ملکیت میں رہا ہوگا یا اس کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے شاہ عالم بادشاہ کی مہر لگا دی ہوگی۔ ذیل

بیت سے اس نسخہ کی ابتدا ہوئی ہے:

امینست احمد را سند این حیدر
اســـت ایـــن حیـــدر اســـت
دور از جمالش چشم بد این حیدر
اســـت ایـــن حیـــدر اســـت

ذیل کے اشعار پر اس کا اختتام ہوا ہے:

سعدالدّین خان چو رفت ازین عالم
دونشد کاس زمان خالی دگر دید
نگوناو بادۂ مردمی بدو گردون
جامجامی که تهی شود نهندش وازون

اس دیوان میں 18 قصائد، 561 غزلیات، 01 ترجیع بند، 03 مثنویات اور 547 رباعیات شامل ہیں اور کل اشعار کی تعداد 6821 ہے۔

03۔ دیوان والہ داغستانی کا نسخہ مملوکہ مولانا آزاد لائبریری دانشگاہ اسلامیہ، علی گڑھ میں کیٹلاگ نمبر 47/115 حبیب گنج کلکشن کے تحت خط نستعلیق میں 174 صفحات پر مشتمل ہے جس میں سن کتابت اور کاتب کا نام مرقوم نہیں ہے، ہر ورق پر 15-11 مسطر شامل ہیں۔ اس کا سایز: 21.5x13.4 سم ہے۔ صفحات کرم خوردہ، پانی کی وجہ سے بوسیدہ اور ان کا رنگ زرد ہو گیا ہے۔ نسخہ اول و آخر میں ناقص ہے۔ نسخہ کے شروع، درمیان اور آخر میں ''کتب خانہ حبیب گنج ضلع علی گڑھ'' کی مہر ہے۔ اول صفحہ اتنا کرم خوردہ ہے کہ مشکل سے پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ پڑھا جاتا ہے جو ذیل میں نقل ہے۔

آنجا که قدت سرو صنوبر چه بود

اس نسخہ کی کتابت کسی ایک شخص کی معلوم نہیں ہوتی، ممکن ہے کئی کاتبوں نے لکھا ہو! غزلیات ردیف کے اعتبار سے آراستہ نہیں ہیں۔ صفحہ 142 کے حاشیہ میں ''منتخب دیوان علی قلی والہ صاحب تذکرۃ الشعرا'' مرقوم ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ والہ داغستانی کا دیوان نہیں ہے بلکہ اس کے دیوان کا انتخاب ہے۔ یہ دیوان تین غزلیات، رباعیات، مثنویات اور قصائد پر مشتمل ہے اور کل 2327، اشعار ہیں۔

04۔ دیوان والہ داغستانی کا نسخہ مملوکہ بوڈیلین لائبریری، اوکسفرڈ یونیورسٹی، انگلیڈ میں موجود ہے جس کا کٹیلاگ نمبر 1186 ہے۔ نسخہ 289، اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر ورق پر تعداد سطور 16-12 خط نستعلیق ہے۔ سایز: 18.5x10.8 سم ہے۔ نیز سن کتابت اور کاتب کا نام مرقوم نہیں ہے۔ نسخہ جا بجا کرم خوردہ ہے۔ اس کے ورق 1ب، پر ایک دیباچہ ہے جو کسی دستیاب نسخہ میں نہیں ہے۔ اس دیباچہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دیوان والہ داغستانی 1157 ہجری میں مرتب ہوا تھا۔ اس دیباچہ کی ابتدا ذیل کی عبارت سے ہوئی ہے:

''بآن حمد صانعی است که سواد و بیاض لیل و نهار درقی از کلیات صفت اوست''

ورق 7ب، سے قصائد کی شروعات ہوئی ہے اور پہلے قصیدہ کا مطلع ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

منم که نیست مرا در جهان شبیه و مثال
مگر خدای عفو رستم و حق متعال

ورق 54ب، سے بالترتیب ردیف غزلیات کا آغاز ہوا ہے لیکن درمیان میں چند رباعیات بھی شامل ہیں۔ ورق 190ب، سے مثنویات کی شروعات ہوئی ہے۔ ورق 206الف، سے قطعات اور رباعیات شروع ہوئی ہیں۔

05۔ دیوان والہ داغستانی کا نسخہ مملوکہ کتابخانہ ملک تہران، ایران میں موجود ہے جس کا کیٹلاگ نمبر 4876 ہے۔ نسخہ 298 صفحات پر مشتمل ہے۔ نسخہ کا سن کتابت اور کاتب کا نام نہیں لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ مجدول اور مطلّا ہے۔ کتابت بہت صاف اور ہر صفحہ کی جدول زرنگار ہے۔ اس نسخہ کے اول صفحہ پر ''آستان قدس رضوی کتابخانہ ملّی تهران'' کی مہر ثبت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ

اسی صفحہ پر لکھا ہوا ہے کہ ''دیوان علی قلی والہ'' صفحہ دو اور تین مطلاّ ہیں ۔اس نسخہ کی ابتدا ذیل کی غزل کے شعر سے ہوئی ہے:

عالم برند رشك بعيش مدام ما

گر عكس چهرۂ تو در افتد بجام ما

آخری صفحہ پر ''کتابخانہ ملّی ملک'' کی مہر ہے۔ مذکورہ دیوا ن 209 غزلیات، 05 مقطعات، 01 منظوم مکتوب اور 367 رباعیات پر مشتمل ہے اور کل اشعار کی تعداد 2188 ہے۔

06۔ دیوان والہ داغستانی کا نسخہ مملوکہ انڈیا آفس لائبریری، لندن میں کیٹلاگ نمبر 1708 کے تحت 59 ،اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر ورق پر 15 - 12 مسطر شامل ہیں اور سایز :11.4x20.10 سم ہے نیز نسخہ خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے اور صاف پڑھا جا رہا ہے۔ نسخہ کا سن کتابت اور کاتب کا نام نہیں لکھا ہوا ہے۔ یہ دیوان ورق 44 سے شروع ہوتا ہے۔ ورق 43 تک کوئی دوسری کتاب ساتھ ہی جلد بندھی ہوئی ہے۔ اس نسخہ کے شروع یعنی ورق 44 میں لکھا ہے ''این کتاب دیوان والہ'' نسخہ کے آخر میں تحریر ہے ''تمام شد دیوان والہ علی خان شش انگشتی''۔ یہ دیوان 10 قصائد، 208 غزلیات، 07 قطعات، 02 مثنویات پر مشتمل ہے اور اشعار کی تعداد 1445 ہے۔

07۔ دیوان والہ داغستانی کا نسخہ کیٹلاگ نمبر: 857 مملوکہ ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال، کلکتہ میں 16، اوراق پر مشتمل موجود ہے۔ یہ نسخہ والہ داغستانی کا مکمل دیوان نہیں ہے بلکہ اس کے دیوان کا ایک مختصر انتخاب ہے۔

ماخذ:

01. آرزو، سراج الدّین علی خان، مجمع النفایس، (تذکرۂ شعرای فارسی سدۂ دوازدہم)، تصحیح و ترتیب عابد رضا بیدار، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1992

02. آزاد، غلام علی، خزانۂ عامرہ، کانپور 1871

03. خوشگو، بندرابن داس، سفینۂ خوشگو، پٹنہ 1959

04. سندیلوی، شیخ احمد علی، مخزن الغرائب، (قلمی) حصہ دوم، مملوکہ کتابخانہ مولانا آزاد، علی گڑھ، حبیب گنج کلکشن نمبر، 51/06

05. صفا، دکتر ذبیح اللہ، تاریخ ادبیات در ایران، جلد پنجم، بخش دوم، تہران 1364

06. فقیر، میر شمس الدّین، مثنوی والہ سلطان، (قلمی)، مملوکہ کتابخانہ مولانا آزاد، علی گڑھ، جواہر فارسیہ کلکشن نمبر، 754

07. فقیر، میر شمس الدّین، دیوان فقیر دہلوی (قلمی) مملوکہ کتابخانہ مولانا آزاد، علی گڑھ، حبیب گنج کلکشن نمبر، 47/79

08. قلی خان، حسین، تذکرہ نشتر عشق، مرتبہ و مترجمہ عطا الرحمٰن عطا کاکوی، پٹنہ 1968

09. والہ داغستانی، علی قلی، دیوان والہ داغستانی، (قلمی) مملوکہ رضا لائبریری، رامپور، شمارہ کتاب 3703

10. والہ داغستانی، علی قلی، دیوان والہ داغستانی، (قلمی) مملوکہ رضا لائبریری، رامپور، شمارہ کتاب 3704

11 . والہ داغستانی، علی قلی، دیوان والہ داغستانی، (قلمی) مملوکہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، حبیب گنج کلکشن، نمبر 47/115

12. والہ داغستانی، علی قلی خان، ریاض الشعرا، مقدمہ تصحیح و ترتیب پر فسور شریف حسین قاسمی، رضا لائبریری، رام پور۔ 2001

13. Ethe, Herman, Catalogue of the Persian Manuscripts in the Library of the King of the India Office, Vol-I, Oxford, 1903.

14. Ivanow, Wladimir, Concise Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts in the collection of the Asiatic Society of Bengal, Calcutta-1924.

15. Ivanow, Wladimir, Concise Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts in the curzon collection, Asiatic Society of Bengal, Calcutta-1926.

محمد شاھد

مضمون

تہذیبی ارضیت نگار: قاضی عبدالستار (افسانوں کے حوالے سے)

قاضی عبدالستار کا شمار اردو فکشن کے معدودے چند تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جن کی شناخت زبان و بیان کے ایک خاص طرز ادا کے باعث قائم ہے۔ زبان و بیان کی وہ دل کشی جو قاری کے ذہن کو اپنی جانب کشید کرتی ہے۔ ایک طرف تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زبان فارسی آمیز ہے تو دوسری جانب دیہی زبان کا ایسا استعمال ہے کہ قاری عالم تحیر میں غوطہ زن ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کی نثر کا اسیر ہو جاتا ہے۔ ناول و افسانہ دونوں اصناف پر ان کی شہرت مسلم ہے۔ اردو ادب میں ایسا کم ہی ہوا ہے کہ کوئی فن کار مذکورہ دونوں اصناف پر یکساں قدرت رکھتا ہو۔ کیوں کہ افسانہ، اختصار کا متقاضی ہوتا ہے اور ناول طوالت کا۔ قاضی عبدالستار کا شمار معدودے چند تخلیق کاروں میں اسی باعث ہے کہ انہوں نے ناول و افسانہ، دونوں اصناف میں یکساں مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اگر ناولوں کا ذکر کیا جائے تو ''شب گزیدہ'' (۱۹۶۲ء)، ''صلاح الدین ایوبی'' (۱۹۶۴ء)، ''داراشکوہ'' (۱۹۶۸ء)، ''غالب'' (۱۹۸۶ء) اور ''خالد بن ولید'' (۱۹۹۵ء) وغیرہ کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور تاریخی ناول میں تو کوئی ان کا ثانی نہیں۔ ناولوں کے حوالے سے قرۃ العین حیدر کا یہ قول ''کہ شب گذیدہ سے بہتر ناول قاضی عبدالستار ہی لکھ سکتے ہیں۔'' ممتاز شیریں کے بہ قول کہ ''داراشکوہ اردو کا پہلا ناول ہے جسے ہم دنیا کے بڑے ناولوں کے ساتھ رکھ سکتے ہیں''۔ اور احسن فاروقی کے اس خیال کو کہ ''قاضی عبدالستار کے ناولوں سے عالمی معیاروں کی بو آتی ہے'' جیسے آرا کو یکسر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اردو ادب میں افسانہ اور صنف افسانہ کا ذکر خیر تو ''پیتل کا گھنٹہ''، ''رضّو باجی''، ''مالکن''، ''بھولے بسرے''، ''سات سلام'' اور ''غادرہ'' وغیرہ کا شمار اردو ادب کے نمائندہ افسانوں میں ہوگا اور صنف افسانہ کے متعلق یہ قول کہ ''افسانہ، چاول پر ''قل ہواللہ'' لکھنے کا عمل ہے'' یا ''نثر پیغامبری ہے اور تخلیقی نثر پیغمبری ہے'' جیسے جملے ہمیشہ اپنی معنویت برقرار رکھیں گے۔

قاضی صاحب کے افسانوں پر گفتگو سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند نکات کی طرف اشارہ کر دیا جائے اور آزادی سے قبل کے ہندوستان کی منظر کشی کر دی جائے کیوں کہ ہر فن کار کا اپنی مٹی سے گہرا ربط ہوتا ہے۔ یہاں قاضی صاحب سے متعلق دو تین غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ اول یہ کہ کچھ حضرات ان پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب انہیں شاعری میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تب وہ نثر کی طرف راجع ہوئے۔ دوم یہ کہ وہ ترقی پسند نظریات کی نفی کرتے ہیں اور سوم یہ کہ وہ پریم چند کی نقالی کرتے ہیں۔

اس ضمن میں پہلا اعتراض تو بے معنی و بے بنیاد ہے۔ کیوں کہ یہ اس عہد کی بات ہے جب وہ طالب علم تھے اور ہر ذہین طالب علم کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اُسے جانیں، اس کی پذیرائی ہو اور کسی بھی طرح اس کی شناخت قائم ہو جائے۔ اس کے لیے وہ ہر صنف میں طبع آزمائی کرتا ہے اور جب صحیح راستے پر آتا ہے تو بقیہ اصناف کو ترک کر کے بس ایک کا ہو کر رہ جاتا ہے تاکہ اپنی بات کو مؤثر انداز میں کہہ سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ قاضی صاحب نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا اور صہبا تخلص اختیار کیا لیکن جلد ہی یہ خمار اتر گیا اور نثر کی طرف راجع ہوئے اور انہوں نے نثر میں خوب نام بھی پیدا کیا۔ اردو میں اس حوالے سے کئی مثالیں موجود ہیں۔ دوسرے اعتراض میں اختلاف کی کچھ گنجائش ہے۔ وہ اس

لیے کہ ہر بڑا فن کار کسی نظریے میں بندھ کر اچھی تخلیقات پیش نہیں کرسکتا اور ہر فن کار کو یہ حق ہے کہ وہ کسی بھی نظریے پر اعتراض کرے، اس کے اصول وضوابط کی پابندی نہ کرے اور آزادانہ طور پر فن پارہ تخلیق کرے۔ قاضی عبدالستار بنیادی طور پر ترقی پسند ہیں۔ انہوں نے افلاس زدہ اور مفلوک الحال اشخاص کو قریب سے دیکھا اور اپنے فن میں سمو دیا لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ ترقی پسند جس طبقے کی شدید طور پر مخالفت کرتے ہیں، اسی طبقے سے قاضی صاحب کا تعلق ہے۔ انہوں نے آزادی کے بعد جاگیردارانہ نظام کو لٹتے، برباد ہوتے اور غربت کے جہنم میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ جس کا انہیں افسوس ہے اور فطری ہم دردی بھی۔ اسی طبقے کی عکاسی انہوں نے اپنے افسانوں میں کی ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو انہوں نے ترقی پسند نظریات کی توسیع کی ہے۔

قاضی صاحب پر تیسرا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے پریم چند کی نقالی کی ہے، جو بے بنیاد ہے۔ اس کا جواب تو دوسرے ہی اعتراض پر دیا جاچکا ہے پھر بھی یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ دونوں افسانہ نگاروں کا کوئی موازنہ نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پریم چند نے دیہی مسائل کی عکاسی کی ہے بل کہ انہوں نے اپنے آپ کو دیہی زندگی کی عکاسی کے لیے وقف کردیا تھا جب کہ قاضی صاحب کا دائرہ وسیع ہے۔ دونوں کے اسلوب میں بھی نمایاں فرق ہے۔ پریم چند نے دبے کچلے لوگوں کی حمایت کی ہے تو قاضی صاحب سراپا سرمایہ داروں کے علم بردار رہے ہیں۔ سرمایہ داروں کے ساتھ ان کا رویہ کسی حد تک درست بھی ہے۔ جس کی بنیادی وجہ تو یہی ہوسکتی ہے کہ انہوں نے سرمایہ داروں کی شکست وریخت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انہوں نے ایسے زمین داروں کو بھی دیکھا جو دوپہر کے وقت کسی دولت مند کسان کے دروازے پر، جن کو انہوں نے ہی زمین دی تھی، اس امید سے جا کر بیٹھ جایا کرتے تھے کہ جب وہ کھانا کھائے گا تو ان سے بھی پوچھ لے گا اور جب وہ پوچھتے تھے تو وہ پورا پیٹ بھر کر اس لیے کھالیا کرتے تھے کہ شاید رات کو کھانا نہ ملے۔ انہوں نے ایسے زمین داروں کو بھی دیکھا تھا جن کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ سے زائد تھی لیکن ان پر ایسا وقت بھی آیا کہ وہ گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے صرف اس لیے کہ ان کے پاس اچھے کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ ان کے بدن پر صرف لنگی اور بنیائن ہوتی تھی۔ جب بھی کوئی کلکٹر اس تعلق دار کو دیکھنا چاہتا، جس کا ڈنکا بجا کرتا تھا تو اس سے یہ کہہ کر صاحب کی طبیعت خراب ہے، بہانہ کردیا جاتا تھا۔ اگر وہ پھر بھی نہیں مانتا اور دیکھنے کے لیے بہ ضد ہوتا تو زمین دار صاحب کو لٹا کر، ان کے جسم پر چادر ڈال دی جاتی تھی کہ مفلسی کا پردہ پڑا رہے۔ انہی وجوہات کی بنا پر قاضی صاحب نے ان افراد کے قصے کو رقم کیا ہے اور یہ بات بلا تردد کہی جاسکتی ہے کہ اودھ کے جاگیرداروں کی زبوں حالی کا نقشہ جتنی خوب صورتی اور فنی چابک دستی کے ساتھ قاضی عبدالستار نے کھینچا ہے کسی دوسرے ادیب نے نہیں۔

آزادی کے بعد اردو فکشن کو بام عروج تک پہنچانے اور اعتبار دلانے میں قاضی عبدالستار کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی زبان اور ان کا اسلوب انہیں دوسرے فن کاروں سے ممیّز کراتا ہے۔ ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے اودھ کے جاگیردارانہ نظام وتہذیب کو اپنا موضوع خاص بنایا ہے۔ اودھ کے سرمایہ داروں کے طرز معاشرت، تقسیم کے بعد ان کی مٹتی ہوئی تہذیب اور زبوں حالی الغرض ایسے تمام نشانات جن سے ان کی شناخت تھی، تمام زاویوں کو انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

قاضی عبدالستار کے افسانوں کو تین ابواب میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ اول وہ افسانے جو انہوں نے شہری زندگی اور وہاں کی تہذیب کو بنیاد بنا کر تحریر کیے ہیں یا جن افسانوں میں شہری زندگی کی چمک دمک، ریاکاری اور عیاری کا بازار گرم ہے۔ کبھی ایسا

بھی ہوتا ہے کہ ان افسانوں کا ماحول تو شہری ہوتا ہے لیکن ایسے معصوم کردار بھی نظر آتے ہیں جو دیہی زندگی کے نمائندے ہوں۔ ''ماڈل ٹاؤن''، ''کتابیں''، ''سوچ'' اور ''تحریک'' وغیرہ اسی قبیل کے افسانے ہیں۔

دوسری قسم کے وہ افسانے ہیں جو انہوں نے تاریخی نوعیت کے لکھے ہیں اور جن میں تاریخ کے حقائق کی بازیافت ملتی ہے۔ تاریخ کے حوالے سے انہوں نے کئی عمدہ ناول بھی لکھے ہیں۔ ناول نگار عبدالحلیم شرر کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں قاضی صاحب کا نام سب سے مقدم ہے۔ اگر افسانے کی بات کریں تو ''سات سلام''، ''نیا قانون'' اور ''بھولے بسرے'' وغیرہ جیسے افسانوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

قاضی صاحب کے ان افسانوں کا ذکر نہایت ضروری ہے جو انہیں ممتاز افسانہ نگاروں کی فہرست میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یہاں اشارہ اُن افسانوں کی جانب ہے جو دیہی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں یا جن افسانوں میں دیہی مناظر کا بیان خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے اور گاؤں کے مکھیا، سرپنچ اور سرمایہ داروں کے شان وشوکت اور بعد میں زوال آمادہ تہذیب کی بُو باس آتی ہے۔ ایسے افسانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ''پیتل کا گھنٹہ''، ''ٹھاکر دوارہ''، ''رضو باجی''، ''مالکن'' اور ''کھا کھا'' ایسے افسانے ہیں جو سرمایہ داروں کی زوال کے دال ہیں اور جہاں قصباتی و دیہی زندگی کے مناظر کا بھی بیان ہے۔ ڈاکٹر محمد غیاث الدین اُن کی افسانہ نگاری پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قاضی عبدالستار کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی اس کی Authenticity ہے۔ ان کی ہر کہانی کسی نہ کسی سچے واقعات پر مبنی ہوتی ہے۔ انہوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسی پر افسانہ لکھا ہے۔ ان کا تعلق سیتاپور کے زمین دار گھرانے سے رہا ہے اس لیے زمین داروں کی زندگی کا تجربہ اور مشاہدہ انہوں نے بہت قریب سے کیا ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانوں میں زمین داروں اور تعلق داروں کا کردار ہی بنیادی ہوتا ہے''۔(۱)

اس ضمن میں پہلا اہم افسانہ ''پیتل کا گھنٹہ'' ہے۔ یوں تو قاضی صاحب نے افسانہ نگاری کی ابتدا ۱۹۴۶ء میں کردی تھی جب ان کا افسانہ ''اندھا'' لکھنؤ کے جریدے ''جواب'' میں شارب ردولوی کے ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا لیکن ان کو شہرت ''پیتل کا گھنٹہ'' سے ملی اور اس کا زمانہ ۱۹۶۴ء کا ہے۔ یہ افسانہ تقسیم کے بعد زمین داروں پر نازل ہونے والی مصیبت کا نوحہ ہے۔ یہاں راوی کا بیانیہ اس وقت شدت اختیار کر جاتا ہے جب وہ پیتل کے گھنٹے کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں پیتل کا گھنٹہ مٹتی ہوئی تہذیب کی علامت ہے کہ سرمایہ داروں پر وہ ہیبت ناک غریبی نازل ہوئی ہے کہ وہ مفلسی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہیں لیکن جہاں مہمان نوازی کی بات آتی ہے تو ضیافت کا یہ عالم ہے کہ اپنی آخری نشانی بھی اس کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں جو کبھی ان کا غلام ہوا کرتا تھا اور ان کے تلوے چاٹتا تھا۔ گھر کے منظر سے یہ بات تو واضح ہو رہی ہے کہ ان کی صورت حال دگرگوں ہے لیکن وضاحت اس وقت ہوتی ہے جب دادی اماں نے ایک بڑے سے پلیٹ میں دو اُبلے ہوئے انڈے کاٹ کر پھیلا دیے تھے۔ اس مفلسی کے باوجود انہوں نے مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور راوی کے بیان کے مطابق اُس نے آج تک اتنا نفیس کھانا نہیں کھایا تھا۔ صبح کو رخصت کرنے وقت دادی کے جذبات ملاحظہ ہوں:

> ''دادی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرے بازو پر امام ضامن باندھا، ان کے چہرے پر

چونا پتا ہوا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ اکاون روپے تمہاری مٹھائی کے ہیں اور دس کرایے کے''۔

''ارے .....دادی..... آپ کیا کررہی ہیں؟'' اپنی جیب میں جاتے ہوئے روپیوں کو میں نے پکڑ لیے۔

''چپ رہو تم .....تمہاری دادی سے اچھے تو ایسے ویسے لوگ ہیں جو جس کا حق ہوتا ہے وہ دے تو دیتے ہیں .....غضب خدا کا تم زندگی میں پہلی بار میرے گھر آؤ، میں تم کو جوڑے کے نام پر ایک چٹ بھی نہ دے سکوں ..... میں .....بھیا..... تیری دادی تو فقیرن ہوگئی ..... بھکارن ہوگئی''(۲)

ان جملوں میں دادی کے جذبات کو قاری اچھی طرح محسوس کرسکتا ہے۔ راوی پر راز آشکار اس وقت ہوتا ہے جب وہ بھسول سے سدھولی کے لیے تانگے پر سوار ہے اور شاہ جی بھی اس کے ساتھ سفر کرتے ہیں جو اِن دنوں ساہوکار ہیں اور ان کے ہاتھ میں پیتل کا وہی گھنٹہ ہے جس پر'' قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اودھ'' کندہ ہے اور راوی اس گھنٹے کو حیرت زدہ دیکھ رہا ہے، شاہ جی راوی کو دیکھ رہے ہیں اور یکے والا ان دونوں کو دیکھ رہا ہے اور یہ سوال بھی پوچھ بیٹھتا ہے:

''کا شاہ جی گھنٹہ بھی خرید لایو؟''

''ہاں کل شام معلوم نائی، کا وقت پڑا ہے میاں پر کہ گھنٹہ دے دیہن بلائے کے ایی۔''

''ہاں وقت وقت کی بات ہے.....شاہ جی ناہیں تو ایی گھنٹہ...'' (۳)

یہاں راوی کو اس بات کا شدید احساس ہے۔ اسی لیے وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے اور ان کے باہم مکالمے میں کوئی دخل اندازی نہیں کرتا۔

اس افسانے میں قاضی صاحب نے اودھ کے سرمایہ داروں کی پوری تہذیب لکھ دی ہے۔ اس افسانے کے ہر ہر لفظ، ہر ہر جملے سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ قاضی عبدالستار نے ترقی پسند تحریک کے نظریات کی بھی توسیع کی ہے۔

اس تسلسل کا دوسرا افسانہ ''ٹھاکر دوارہ'' ہے۔ اس افسانے میں براہ راست زمین داری کے ختم ہونے اور ساتھ ہی ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کا نوحہ ہے جو اس کے حق دار ہیں ہی نہیں۔ پتمبر پاسی جسے نہ جینے کا شعور ہے نہ مرنے کا سلیقہ اور ایسے حالات میں اس کی تقدیر بدل جائے تو اسے کیسے نیند آسکتی ہے۔ جو زندگی بھر پہرے داری کرتا آیا ہو اور عمر کے آخر پڑاؤ میں گاؤں کی پردھانی مل جائے تو اس کی ذہنی نفسیات کا کیا عالم ہوگا۔ اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے جب وہ دریاپور کا پردھان چن لیا گیا ہے۔ اس کے گھر کے باہر لوگ خوشی کے مارے بندوق چھوڑ رہے ہیں اور گولے داغ رہے ہیں۔ دالان پر پہرہ کھڑا ہو چکا ہے اور ہال کے پردوں سے آواز آتی ہے کہ پتمبر کو اندر بھیج دو۔ دونوں کے مابین گفت گو ملاحظہ ہو:

''ٹھاکر کے سامنے خالی گلاس اور بھری بوتل رکھی تھی۔

''مبارک ہو!''

''سرکار!'' اس کے منھ سے اور کچھ نکلا ہی نہیں

۔

''آج سے تمہاری پہرے داری موقوف''۔

''سرکار!''

''پلنگ کا پہرے دار گاؤں کی پردھانتا نہیں
کرسکتا؟''

''سرکار!''

''اورتم پردھانتا چھوڑ بھی نہیں سکتے کہ اگر ہم
پراس سے براوقت آ گیا تو کم ازکم ایک
پردھان تو ہمارے ساتھ ہوگا''۔(۴)

یہ تھی اودھ کے زمین داروں کی صورت حال۔ایک شخص جو صحیح طریقے سے بات کرنے پر قادر نہیں ہے، وہ آج ہمارے معاشرے کا نمائندہ ہے۔پتمبر پاسی کے رگ وپے میں لجاحت اور تکلف سرایت کیے ہوئے ہے اور یہ لجاجب اور تکلف رؤ ساسے قدرے مختلف ہے۔اس میں نہ تہذیب کا رکھ رکھاؤ ہے نہ زندگی گذارنے کا سلیقہ۔آزادی کے بعد یہی وہ اودھ ہے جس کی مٹتی تہذیب کا قاضی عبدالستار نے نقشہ ہمارے سامنے بیان کر دیا ہے۔

تہذیبی رکھ رکھاؤ کے حوالے سے افسانہ ''نیا قانون'' بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔اس افسانے میں زمین داروں کا تو نہیں البتہ زمین داروں کے سربراہ یعنی بادشاہوں کی زبوں حالی کا نوحہ ہے۔یہ افسانہ سیتاپور کا نہیں بل کہ لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب اور وہاں کے نوابین کے قلع قمع ہونے کا تذکرہ ہے۔پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد پورے ہندوستان خصوصاً دہلی، رام پور اور لکھنؤ کی سلطنت کا جو حشر ہوا وہ کسی سے اوجھل نہیں ہے۔قاضی صاحب کا یہ افسانہ بھی اسی زبوں حالی کا نوحہ ہے۔سلطنتیں مٹ جاتی ہیں، ان کی تہذیب آہستہ آہستہ تاریخ کے دھندلکے میں گم ہوجاتی ہے لیکن اس کے آثار تاریخ کے صفحات میں باقی رہتے ہیں۔

قاضی صاحب کا نام ذہن پر آتے ہی کچھ افسانوں کے عنوان فوراً ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔انہی افسانوں میں ایک افسانہ ''مالکن'' بھی ہے۔سابقہ افسانوں کی طرح یہ افسانہ بھی سرمایہ داروں کا مٹتی تہذیب کا نوحہ ہے۔ ہندوستان تقسیم ہوچکا ہے۔میر محمد علی بیگ انتقال فرما چکے ہیں اور ان کی بیوہ رونق پور کی ''مالکن'' پر کسٹوڈین پر مصیبت نازل ہوچکی ہیں۔ان کی کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے۔مالکن کا یہ حال ہے کہ مقدمے ان کے ساتھ جونک کی طرح چمٹ گئے ہیں اور خون کا ایک ایک قطرہ چوس رہے ہیں۔ان کے دور کے رشتے دار یہ خواہش بھی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ پاکستان چلی جائیں لیکن ان کو اپنی عزت نفس اور غیریت کا اتنا پاس ہے کہ مالکن ان کے ساتھ جانے سے منع کردیتی ہیں۔ان کے گھر کھانے کا کچھ بھی نہیں ہے اور رام پرساد اپنی دکان سے سودسلف بھی بند کردیتا ہے۔ایسے عالم میں مالکن چودھری گلاب سے ایک راز کی بات کرتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہاں میں تم سے ایک بات کہنے والی تھی''۔

''حکم!''

''یہاں رونق پور میں..... کسی اور گاؤں میں کوئی.....''

''میں نے کہا سرکار میں سمجھا نہیں''۔

''کوئی کرتے پہنتا ہے''۔

مالکن نے ایسی بھرائی ہوئی..... چیخ مارتی ہوئی آواز میں کہا جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی خبر سن کر پھٹ پڑی ہو۔بوڑھا چودھری گلاب سوال کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔

''ہاں تم سے کیا چھپانا چودھری
گلاب۔تم تو اس حویلی کے تنکے تنکے سے
واقف ہو۔تم تو حویلی کی دائی گری کرچکے ہو
اور دائی سے کیا پیٹ چرانا۔آدمی حق سب چلے
گئے۔عورتیں اِدھر اُدھر ہوگئیں۔اتنے بڑے

گھر میں اکیلی بیٹھی کوّے ہنکایا کرتی ہوں۔
رات تو روتے گذر جاتی ہے مگر یہ پہاڑ ایسے
دن چھاتی پر سوار رہتے ہیں۔
ٹالے نہیں ٹلتے۔ کوئی کرتا اُرتا ہو تو سینے پرو نے
میں دل اٹک جاتا''۔(۵)

پردے کا یہ عالم ہے کہ مالکن نے اپنی مفلسی کا کہیں تذکرہ نہیں کیا اور چودھری گلاب کو یہاں تک تنبیہ کردی کہ میرا نام کسی سے نہ بتانا۔ چودھری گلاب، مالکن کا بہی خواہ ہے۔ وہ ذکر تو یہ کرتا ہے کہ اس نے ٹھاکر گھنشیام کے گھر سے کرتے کا کپڑا لایا ہے لیکن اصل ماجرا کچھ اور ہی ہے۔ چودھری ہی کپڑا لے آتا ہے تاکہ مالکن کی مفلسی کا پردہ پڑا رہے۔ اِدھر چودھری گلاب کو مالکن سے ہم دردی ہے تو اُدھر گھر والے چودھری گلاب پر شک کررہے ہیں کہ اس کا مالکن سے چکر ہے۔ اسی لیے مالکن کے پیچھے دیوانہ ہوگیا ہے۔ اس غم کو برداشت نہ کرکے وہ چل بستا ہے اور مالکن کا اب کوئی بہی خواہ نہیں ہے۔ اب وہ نوکرانی کو اس بات پر راضی کرلیتی ہے کہ جیت پور جاکر ٹھاکر گھنشیام سے کپڑے کے متعلق بات کرآئے کہ اچانک وہ خود ہی آجاتے ہیں اور مالکن ڈیوڑھی پر کھڑے ہوکر ٹھاکر سے کہہ رہی ہوتی ہے کہ ''اپنے کرتوں کی تزیب تو آپ بھیجتے رہئے گا لیکن پہلے یہ میرے چاروں کرتے بکوا دیجئے''۔

ایک ٹھاکر کے سامنے مالکن کے ان جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات بدل چکے ہیں اور ایک شخص اپنی عزت اور شناخت برقرار رکھنے کے لیے اس طرح کے جتن کررہا ہے ورنہ قصہ یوں بھی تمام ہوجاتا کہ مالکن ان بکھیڑوں سے نجات پانے کے لیے خودکشی کی طرف مائل ہو لیکن یہ ایک زمین دار کا شیوہ نہیں ہے اس لیے وہ عزت نفس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔

اس ضمن میں آخری اور اہم افسانہ ''رضو باجی'' ہے۔ یوں تو اس افسانے کا بنیادی موضوع ایک لڑکی کی داخلی نفسیات ہے اور ایک زمین دار گھرانے کی شریف النفس لڑکی کی نفسیات کو بنیادی حوالہ بنایا گیا ہے لیکن اس کے پس پشت وہ عوامل بھی کارفرما ہیں جو اسے بہانہ بازی کرنے پر اکسا رہی ہیں۔ افسانے میں رضو باجی پر کبھی جن سوار نہیں ہوتے البتہ انہوں نے اس کی تشہیر اس لیے کردی ہے تاکہ گھر والے ان کی شادی ہر ایرے غیرے سے نہ کردے بل کہ اس میں رضو باجی کی مرضی بھی شامل ہو۔ ایک حسین لڑکی کے حسن کا تقاضا بھی یہی ہے کہ شوہر کے انتخاب میں اس کا بھی اختیار ہو۔ افسانے میں نفسیات کی ہلکی سی پرت کو محسوس کرتے ہوئے ممتاز مفتی کے ''آپا'' کی یاد شدت سے آتی ہے۔ وہاں بھی صورت حال تقریباً یکساں ہے بس ماحول اور علاقے کا فرق ہے۔

افسانہ کے آغاز میں سرمایہ دارانہ نظام کا موازنہ آج کے معاشرے سے کیا گیا ہے اور بیان کنندہ اس بات کی بھی توضیح کررہا ہے کہ سارنگ پور سے رضو باجی محرّم دیکھنے اس کے گاؤں آرہی ہیں اور وہ ان کے حسن کا شہرہ کئی برسوں سے سن چکا ہے۔ رضو باجی کو دیکھ کر لوگوں کی تعریفیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں اور رضو باجی کا چہرہ اور بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں رضو باجی کو راوی (اجّن) بھی پسند آجاتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ محرم دیکھنے جاتے ہیں اور ایک کنویں کے پاس کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس دوران ان کی ملاقات کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

''انہوں نے میرے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ چادر
اُن کے شانوں سے ڈھلک گئی۔ گھٹی گھٹی آواز
میں بڑے کرب سے بولیں''۔
''چلو یہاں سے بھاگ چلو''۔
ان کا سر میرے شانے پر ڈھلک آیا اور میں
نے سرخ بالوں کی ریشمی لپٹوں میں اپنے ہاتھ
جلا لیے جن کے داغ آج بھی جلد کے نیچے
محفوظ ہیں۔

''محرم کی اس رات کے آخری حصے میں جو شخص اس کنویں سے اپنے دل کی ایک مراد مانگتا ہے وہ پوری ہوجاتی ہے''۔

وہ مجھ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھیں اور میں اس دنیا میں تھا جو پہلی بار میرے حواس نے دریافت کی تھی۔ آپ ذرا دیر کے لیے مجھے چھوڑ دیجیے میں ایک دعا مانگ لوں.....۔ آج کے بعد پھر کبھی اس کنویں سے کوئی دعا نہ مانگوں گا۔''(۶)

انّجن کا رضو باجی کے سامنے کنویں پر دعا مانگنا باجی کے دل میں کھٹکا پیدا کرتا ہے۔ اور وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتی ہیں اور یہی غلط فہمی انہیں تنہا رہنے پر مجبور کرتی ہے جس کا انکشاف افسانے کے آخر میں ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ قاضی عبدالستار کے اس نوع کے افسانے بکھرے پڑے ہیں جن میں سرمایہ دارانہ نظام کی زبوں حالی کا ذکر بار بار آتا ہے۔ یہی ان کا اختصاص ہے کہ انہوں نے ان زمین داروں کی مٹتی تہذیب کو افسانوں کی شکل میں رقم کر کے محفوظ کر دیا ہے۔ ان کی زبان ایک خاص قسم کی ہے جن میں تبدیلی کرداروں کے بدلنے سے ہوتی رہتی ہے۔ وہ تشبیہات کا استعمال خوب صورتی سے کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی اس کا استعمال اتنی کثرت سے ہوتا ہے کہ قاری ان متون میں بوجھل پن کو صاف طور پر محسوس کر سکتا ہے۔ آخر میں کلی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ قاضی عبدالستار کی شناخت منفرد لب و لہجے کی بہ دولت قائم ہے۔

OOO

حواشی۔

۱۔ محمد غیاث الدین (مرتب) ۔''آئینۂ ایام'' ۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۱۹۹۵ء صفحہ نمبر ۱۲

۲۔ قاضی عبدالستار۔ افسانہ '' پیتل کا گھنٹہ''۔ مشمولہ ''آئینۂ ایام''۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۱۹۹۵ء ص ۵۵

۳۔ قاضی عبدالستار۔ افسانہ '' پیتل کا گھنٹہ''۔ مشمولہ ''آئینۂ ایام''۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۱۹۹۵ء ص ۵۶

۴۔ قاضی عبدالستار۔ افسانہ ''ٹھاکر دوارہ''۔ مشمولہ ''آئینۂ ایام''۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۱۹۹۵ء ص ۲۵

۵۔ قاضی عبدالستار۔ افسانہ ''مالکن''۔ مشمولہ ''آئینۂ ایام''۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۱۹۹۵ء ص ۱۰۲

۶۔ قاضی عبدالستار۔ افسانہ ''رضّو باجی''۔ مشمولہ ''آئینۂ ایام''۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۱۹۹۵ء ص ۳۳

''آخری سواریاں'' اردو ادب کے صف اول کے ناولوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور ایک سنگ میل

قاضی عبدالستار

سید محمد اشرف

کا نیا ناول

''آخری سواریاں''

صفحات: 209

قیمت: -/250 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

فرحانہ انجم

علی عباس حسینی

علی عباس حسینی کے ابتدائی دور کی افسانہ نگاری میں گوناگوں قسم کی آمیزش ملتی ہے۔جو شاید ہی کسی افسانہ نگار کے یہاں نظر آئے ابتدائی دور کے افسانوں میں وہ یوپی کے مشرقی اضلاع کے سید پٹھان اور ٹھاکروں کی حالاتِ زندگی کے نشیب و فراز کی ہو بہو تصویر کشی ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ان کی افسانہ نگاری کا ابتدائی دور خالص رومانیت کا دور رہا اسوقت انہوں نے جذبہ کامل نامی افسانہ لکھا۔بہر حال وہ ایک خاص دور کی پیداوار تھی۔جس کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ ان کی افسانہ نگاری میں نکھار پیدا ہوتا گیا۔رومانیت افسانوی مجموعہ ''رفیق تنہائی''میں زیادہ غالب ہے ۔لیکن اس کے فوراً بعد ان کے دو افسانے''آئی۔سی۔ایس''اور''باسی پھول''وغیرہ ایک نئے انداز میں سامنے آئے ۔ اتنا حیرت انگیز تغیر حسینی کے علاوہ شاید کسی دوسرے کی بس کی بات ہو۔انہوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کرنے مزدوروں اور کسانوں اور متوسط طبقہ کی زندگی کے حالات کو بخوبی پیش کیا۔علی عباس حسینی نے شعوری طور پر دنیا بھر کے افسانہ نگاروں کا اثر قبول کیا۔ان کے وسیع مطالعہ کی بدولت ان کی تخلیقات پرانی ہونے کے باوجود اس کا شمار جدید ادب میں کیا جاتا ہے۔

عبادت بریلوی حسینی کے تعلق سے رقمطراز ہیں کہ۔

> ''جو مصنف زمانے کے ساتھ اس طرح اور اس قدر کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہو اس کی ذہانت اور اظہار کی طباعی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ چنانچہ علی عباس حسینی نصف پریم چند اعظم کروّی اور سدرشن کے ساتھ ساتھ نصف ترقی پسندوں اور جدت پسندوں کے ساتھ۔''

مذکورہ خیال کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان تینوں افسانہ نگاروں کے زیر اثر اپنی تحریر کو سپرد قلم کیا اس کے علاوہ ان کا شمار جدت پسندوں میں کیا جانے لگا۔اگر چہ علی عباس حسینی نے پریم چند کے اثرات کو قبول کیا تھا۔لیکن ان کے فن میں ایک ارتقا کی کیفیت موجود تھی۔اور انہوں نے وقت اور ماحول کے تیوروں کو دیکھ کر جس کشادہ دلی کے ساتھ جدت پسندوں اور ترقی پسندوں کا ساتھ دیا وہ حیرت انگیز ہے۔''رفیق تنہائی''افسانوی مجموعے کے بعد کا افسانوں کا مقابلہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے ۔اس کے علاوہ حسینی نے ترقی پسند تحریک سے ہندو مسلم فرقہ وارانہ منافرت کے خلاف کئی افسانے لکھے۔ان کے یہاں متوسط طبقے کی رومانی کشمکش کا عکس نظر آتا ہے۔حسینی کے افسانوی سفر کو تین ادوار میں تقسیم کیا جائے تو بجانہ ہوگا۔افسانے کے ابتدائی سفر میں رومانی دور کی کہانیوں میں رنگینی جذبات کے ساتھ قصہ گوئی کا رنگ نمایاں تھا۔ان کے ابتدائی افسانوں کا محور عورت تھی۔عورت کا حسن شباب اس کی عشوہ کاریاں اور عشق و ارمان سے پیدا ہونے والی صد رنگ کیفیات کے بارے میں بارہا جلوے نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ علی عباس حسینی کو معاشرے کے سبب آگاہی کا احساس ہوا۔لہٰذا معاشرے کی برائیوں پر قلم اٹھاتے وقت ان میں جذباتیت عود کر آئی۔ان کے اس دور کے افسانوں میں زندگی کے مختلف مظاہر پر عورت کی شخصیت کی گرفت مضبوط ہے خواہ وہ وہ مشرقی ہو یا مغربی

تہذیب کی باہمی آویزش کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔
مسلم معاشرے میں بیوہ کی شادی کے مسئلے کو یا امیر طبقے کے عیش پسندوں یا بدی کی طاقتوں تصادم میں علی عباس حسینی کا رومانی تصور ہر جگہ اپنا رنگ دکھا تا ہے۔ اسلیئے انکا اسلوب اور طرز فکر دونوں میں شعلے دہکتے رہتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں نہ صرف عورت کا حسن ہی ان کے یہاں موجود نہیں بلکہ عورت کا درجہ بھی بہت بلند ہے۔ جو ماں بہن بیٹی کسی بھی روپ میں ہوں ایثار و قربانی و وفا کی دیوی ہے ۔ جو خار دار کو گلزار بنا سکتی ہے جو صحرا میں گلاب کھلا سکتی ہے جو بھٹکوں کو راہ دکھائی ہے نور و نار بیوی کے کردار میں اس کا روپ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ بے باک بے وفا اور ہرجائی عورت بھی ان کی کہانیوں کے کرداروں میں شامل ہے۔ لیکن علی عباس حسینی نے انھیں نا انصافیوں کا شکار ہونے سے بچایا ہے ۔ اس کے علاوہ طوائف کی زندگی کی کہانی بڑے پر اثر انداز میں اپنے افسانوں میں بیان کی ہے۔ رومان اور عورت کے علاوہ ابتدائی افسانہ نگاری کے دور میں اصلاحی جذبہ بھی موجود تھا۔ اس لئے افسانوی مجموعہ ''باسی پھول'' میں محبت اور نیکی کے جذبات ساتھ ساتھ ملتے ہیں۔ دراصل ایک اصلاحی افسانہ ہی ہے علی عباس حسینی کا یہ اصلاحی رنگ انھیں عام عشقیہ افسانوں سے مختلف اور حقیقت نگاری کے قریب کر دیتا ہے ۔ اُردو افسانے کی ارتقاء میں سماجی اصلاحی فقدان کے یہاں موجود ہیں ۔ اس کے علاوہ دیہاتی زندگی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے ۔ علی عباس حسینی کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کے عام نقوش واضح نظر آتے ہیں۔ انہوں نے دیہاتی زندگی کے مسائل کو ایک نئی روشنی میں پیش کیا ہے ۔ اصل میں علی عباس حسینی شروع ہی سے حقیقت نگار تھے۔ ایک رجحان اصلاح پسندی کا تھا۔ جس میں سب سے نمایاں ذات پات کے نظام کی اصلاح تھی۔ اس کے پس منظر میں ہمیں گاندھی جی کی وہ تحریک صاف نظر آتی ہے جس کا مقصد ہندوستانی عوام کے تمام طبقات کا اعتماد اور اتفاق تھا۔ دوسرا رجحان جاگیردار نہ طبقے کے ہاتھوں کا شتکاروں کا معاشی استحصال اور سماجی تذلیل کے خلاف کراہیت کا احساس ہے۔ علی عباس حسینی نے افسانہ انتقام میں کسی حد تک جاگیرداروں کے ہاتھوں کا شتکاروں پر ڈھائے جانے والے مظالم بیان کر کے حقیقت نگاری کا ثبوت دیا۔ اس کے علاوہ غربت افلاس سے نچلے طبقہ کے افراد میں خود فریبی کے جوتا نے بانے اپنے گرد بن رکھے ہیں اس کی تصویر علی عباس حسینی نے اپنے افسانے کی کہانی ''خوش قسمت لڑکا'' میں فنکارانہ نزاکتوں اور معاہدہ میں ایجاز دکھانے کے بعد علی عباس حسینی اخیر میں بتاتے ہیں کہ ''ایک دادی اپنے کمسن پوتے کو ایک فقیر کے ساتھ بھیک مانگنے کے لئے چھوڑ جاتی ہے اور مڑ کر کہتی ہے میرے مالک تو نے میرے پوتے کو اتنا خوش قسمت بنا دیا کہ نویں برس ہی کام پر لگ گیا۔ اس دور میں علی عباس حسینی کا سیاسی و سماجی شعور بہت واضح تھا۔ انہوں نے اپنے نظریہ اصلاحیت اور مقصدیت کے رنگ کو مدنظر رکھ کر کئی افسانے لکھے ہیں ۔ افسانہ ''طمانچہ'' میں دو تہذیبوں کے ٹکراؤ اور اس میں جدید مغربی تہذیب سے دور رہنے کا درس دیا۔

قیام پاکستان کے فسادات وہ موضوعات ہیں جنہوں نے ہندوستان کے بیشتر افسانہ نگاروں کو متاثر کیا۔ اور بے شمار افسانے لکھے۔ اور دنیا میں پہلی بار کسی ملک کے فنکاروں نے اپنے زمانے کے واقعات کے متعلق بصیرت کا ثبوت دیا۔ لیکن ''ہمارا گاؤں'' کے چند افسانون میں رومانی اور اصلاحی رنگ جا بجا ملتا ہے۔

پروفیسر وقار عظیم علی عباس حسینی کے تعلق سے رقمطراز ہے کہ۔

> ''تقسیم کے بعد علی عباس حسینی نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں وہ بلندی ہے جو کبھی علی عباس حسینی کے فن کا امتیاز رہی ہے لیکن ''رحیم بابا''

اور ''جل پری'' جیسے افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مبلغ، مصلح اور سائنس کے منصب کو یکجاء کرنے کے باوجود افسانہ نگار نے یہ بات کبھی فراموش نہیں کی کہ وہ قصہ گوہ ہے اور قصہ گوئی ان کا اولین منصب ہے۔''

اس کے علاوہ ''نورونار'' ایک کامیاب اصلاحی افسانہ ہے اس افسانے میں انہوں نے ایک مثالی مسلم خاتون کا کردار بیان کیا ہے۔ اس میں چند اسلامی مسائل یعنی اسلام میں بیک وقت چار نکاح کی اجازت طلاق، میت کی تجہیز و تدفین، نماز وسنت وغیرہ سب پر بحث کی ہے۔

علی عباس حسینی کے افسانوی ادب کے تیسرے دور کے افسانے اصلاحی دیہاتی رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں دیہاتوں کی بہترین تصویر کشی کی ہیں۔ دیہاتوں کے معصوم جذبات اور احساسات کو شاندار طریقے سے بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ علی عباس حسینی نے ترقی پسند تحریک کا بھی ساتھ دیا۔ اور ساتھ ساتھ انکے یہاں نفسیاتی تجزیہ کا واضح میلان بھی ملتا ہے اس کے علاوہ انہوں نے جدید اُردو افسانہ نگاری میں معاش اور جنس کی تلخ و شرین حقیقتوں کا پردہ چاک کیا۔ علی عباس ویسے تو شروع سے ہیا صلاحی و تعمیری کہانیاں لکھتے رہے۔ آخری افسانوں کا مجموعہ ''ندیاں'' کنارے آزاد ہندوستان کی ترقیاتی پروگراموں اور منصوبہ بندیوں کے کاموں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس مجموعے میں ملک کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لینے کی طرف عوام کو رجوع کیا گیا۔ یہ سب کہانیاں پروپیگنڈہ نہیں ہیں۔ بلکہ علی عباس حسینی کے دل میں آزاد ہندوستان کی محبت اور عقیدت کے جو جذبات ہیں وہ ہندوستان کو خوشحال اور بہت سی سماجی برائیوں سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس تعلق سے علی عباس حسینی رقمطراز ہیں۔

''اس زمانہ کے افسانہ نویسوں اپنے ملک کی ترقیاتی پروگراموں اور منصوبہ تبدیلیوں کے کاموں کی طرف بھی توجہ کرنا چاہئے۔ منصوبہ بند تعمیری افسانے بھی لکھنے چاہئے شترا کی ممالک کی ریس کرنے والوں کو روس، چین سے سبق لینا چاہئے۔ جہاں سارا ادب خالص تعمیری ہے۔''

علی عباس حسینی نے ایک کردار کی زبانی جنگ آزادی کی کہانی بیان کی ہے اور آزادی سے قبل ہندوستان کا نقشہ کھنچا ہے۔ جس میں کسانوں پر ظلم ہوئے تھے۔ بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ برطانوی دور اور اس کے خلاف جنگ آزادی فرقہ واریت تقسیم ہند اور فسادات وغیرہ ان سب موضوعات پر علی عباس حسینی نے اپنے خیالات کو اپنی افسانہ نگاری میں خوب کھل کر بیان کیا ہے۔ جو ہندوستان کی آزادی سے قبل بیان نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ملک میں ہونے والی صنعتی ترقی کی تصویر بھی علی عباس حسینی نے اس مجموعے میں کھنچی منصوبوں کا جائزہ بڑی مہارت اور تفصّل سے بیان کیا ہے۔ جس سے ان کی وطن سے محبت اور دیش میں ایک صنعتی انقلاب پر خوشی کا اظہار ملتا ہے۔ اسطرح علی عباس حسینی نے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنا کام اچھی طرح انجام دیا۔ افسانہ نگار جو زندگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ ہر دور کے اثرات قبول کرتا ہے علی عباس حسینی نے کبھی جدید ہندوستان کو دیکھا اور اس کی ترقی دیکھ کر روشن مستقبل کے لیئے پُر اُمید نظر آتے۔

OOO

راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر/اشرف رفیع

یادیں

جب ہمارے گھروں میں انگریزی کھانا آیا تو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے انگریز گورنس بھی آئیں۔ بچے کی ولادت سے قبل ہی گورنس مقرر کی جاتی جو برٹش ریزیڈنسی سے تعلق رکھتی تھی نواب ولی الدولہ بہادر کے پاس بھی یہی طریقہ تھا۔ ان گورنس کا کام تھا صبح جاگنے کے بعد منہ ہاتھ دھلوا کر ہمیں پرائم میں ڈال کر باغ میں گھومنے لے جاتی تھیں۔ ہماری گورنس ریزیڈنسی سے ہی آئی تھیں وہ ہمارا بہت خیال رکھتی تھیں ابھی ہم بہت چھوٹے تھے دانت بھی نہیں نکلے تھے۔ چمچ سے شربت اور دودھ پلاتی تھیں۔ ولایت سے آئے ہوئے بسکٹ کھلاتی تھیں ہمارے گلے میں ایرین بندھا ہوتا تھا اسی سے منہ پونچھتی تھی جب ہمارا ناشتہ ہو جاتا باغ کی سیر ہو جاتی اور بڑے لوگ ناشتے سے فارغ ہو جاتے تو پھر ہمیں دادی ماں، مما اور پاپا کے پاس لے جاتیں۔ گورنس کو رکھنے کی اہم وجہ یہ تھی کہ ہم اہل زبان سے انگریزی سیکھیں۔ باغ کی سیر کرواتے ہوئے باتوں باتوں میں وہ ہمیں CAT، RAT سیکھاتی تھیں Sound System جب ذہن میں بیٹھ جاتا تو پھر نئے الفاظ سکھاتی تھیں یہ گویا ایک طرح سے قافیہ سازی تھی۔

میری پہلی سالگرہ پر سالار جنگ اول نے ایک پونی دی تھی جس کا نام ''لکشمی'' جب میں نے چلنا سیکھا تو مجھے گھوڑے پر بیٹھا کر سیر کرواتی تھیں۔

خیر بہت برسوں بعد ایک دن میں پرانے فائیلوں کو دیکھ رہی تھی انہیں جھاڑ جھٹک کر جما رہی تھی جس فائل کو میں ڈھونڈ رہی تھی تو نہیں ملا کچھ اور فائل مل گئے ایک فائل کھولا الٹ پلٹ کیا تو ایک خط میرے ہاتھ لگا سوچی کس کا ہوگا؟ پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے پڑھتے میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ اسی خط کا میں یہاں ذکر کر رہی ہوں بلکہ وہی خط پیش کر رہی ہوں۔

''میں نے آپ کو ایک خوب صورت بچی کی طرح دیکھا تھا آپ کے گھنے بال تھے۔ یہ میرا اسٹائل ولایت کا ایک مقبول اسٹائل تھا ریزیڈنسی کی ایک بچی جب ولایت گئی تھی اس کے بال بنائے گئے تھے۔ مگر آپ بڑی شریر تھیں۔ آپ کے کپڑے پیرلیس سے بن کر آتے تھے آپ کا چاندی کا جھولا بھی پیرلیس ہی سے آیا تھا۔ وہ بڑے خوب صورت دن تھے جو میں نے آپ کے محل نما گھر میں گزارتے تھے آپ کی فیملی میں گزارے تھے۔ جب آپ تین برس کی ہوئیں تو آپ کا بھائی پیدا ہوا میری کزن جو ریزیڈنسی میں ہوا کرتی وہ ان کی گورنس مقرر ہوئی۔ بچہ تو ابھی ابھی پیدا ہوا تھا آپ دو تین برس کی تھیں تھوڑا تھوڑا چلنا آ گیا تھا ہمیں خوب بھگاتی تھیں۔ بھاگتے بھاگتے جب آپ لان پر گر جاتیں تو آپ کو مار لگتا زخم آ جاتا اس پر آیوڈن لگانا پڑتا تھا۔ آیوڈن کی جلن سے آپ چیخنے لگتی تھیں اس وقت آپ کو سنبھالنا بڑا مشکل ہوتا تھا جب بھی آپ کو باغ کی سیر کے لیے لے جاتے تو پیچھے پیچھے آیا آیوڈن اور روئی لے کر ضرور آتی اگر اس پر آپ کی نظر پڑ جاتی تو آپ رونا شروع کر دیتی تھیں پھر آپ کو ہمیں سمجھنا پڑتا کہ یہ آپ کے لیے نہیں وہ جو کتے ادھر اُدھر پھر رہے ہیں یہ ان کے لیے ہے پھر آپ خاموش ہو جاتیں۔ خوب صورت ایمرائڈری کی دستی سے آپ کے آنکھ ناک پونچھنے پڑتے تھے۔ یہ دستیاں بھی تو ولایت ہی سے آتی تھیں (مما اور سبھی ایسی ہی دستیاں استعمال کرتی تھیں) جب آپ نرسری سے باہر نکلتیں تو چلتی کم تھیں بھاگتی زیادہ تھیں۔ اس گھر میں تین لان تھے تینوں ایک ایک ایکڑ کے تھے۔ آپ اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے دور تک نکل جاتی تھیں ہم آپ کے پیچھے آسانی سے

دوڑنہیں پاتے تھے ہم سب آپ کے پیچھے ایک لائن میں دوڑتے تھے اس ڈر سے کہ کہیں آپ گر نہ جائیں آپ کا باغیچہ بڑا خوب صورت تھا وہاں پھولوں اور پھلوں سے لدے درخت ہوا کرتے تھے Firms تو کئی قسم کے تھے مجھے یاد ہے پھلوں میں جام سیتا پھل، لیمو، سنترہ، انار، چیکو، انجیر، موز اور الائچی موز کے بھی درخت تھے۔ لوہے کے بنے ایک منڈوے پر انگور کی بیل چڑھی ہوتی تھی۔ سیر و تفریح کا وقت ختم ہو جاتا تو مالی لوہے کی بنی باڑ کے دروازے پر قفل ڈال دیتا تھا اور پھر صبح کھول دیتا تھا۔ لان پر خوب صورت سے فوارے تھے جو ماربل کے بنے ہوئے جس میں سے پانی کی پھواریں نکلتی تھیں۔ درمیانی لان پر ماربل کا بنا ایک شاندار ہرکیولس تھا۔ مجھے امید ہے کہ وہ گارڈن اب بھی ویسا ہی ہوگا۔ آپ کو یاد نہیں ہوگا مگر مجھے یاد ہے آپ ہرکیولس کے چکر کاٹتیں۔ اسے دیکھ کر مسکراتیں تالیاں بجاتی تھیں۔ ہم آپ سے کہتے کہ دیکھو وہ آپ کو دیکھ کر مسکرا رہا ہے، آپ سے کچھ کہہ رہا ہے۔ صبح کی ہلکی ہلکی دھوپ جب ماربل کے ہرکیولس پر پڑتی تو اس کے Expression بدل جاتا۔ ایسے کتنے ہی نظارے میری آنکھوں میں ہیں ایسا لگتا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں واپس اسی زمانے میں چلی جاتی ہوں۔

آپ بطخوں کے پیچھے بھاگتی تھیں ایک چھوٹا لڑکا ان بطخوں کی نگرانی کے لیے تھا جو بطخوں کے ساتھ رہتا تھا۔ دو سفید مور بھی تھے اور چھوٹے چھوٹے خرگوش بھی جو بھی جانور آپ کو دکھائی دیتا آپ اس کے پیچھے چلی جاتیں ہر دفعہ آپ کو گرنے سے بچانا پڑتا تھا۔

آپ کے بھائی چھوٹے تھے انہیں پرائم میں بٹھا کر صبح کی سیر کروائی جاتی تھی کبھی آپ گیارینجس کی طرف بھاگتیں کبھی اصطبل کی طرف اور وہاں لکشمی کے پاس جا کر کھڑی ہو جاتیں۔ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ بڑھا کر اسے لہسن کھلاتی تھیں ہم گھبرا جاتے کہ کہیں آپ کے ہاتھ کاٹ نہ لے۔ ابھی آپ کو بات کرنا نہیں آیا تھا آپ ابراہیم کا شرٹ کھینچ کر اشارہ کرتیں کہ مجھے گھوڑے پر بٹھاؤ۔ وہ سمجھ جاتے اور کہتے بی بی سرکار کل صبح آپ کو میں گھوڑے پر لے جاؤں گا ابھی نہیں آپ ابراہیم کے چہرے کو گھورتیں اور روٹھ جاتی تھیں پھر گیرینجس کی طرف جاتیں وہاں آپ کے والد کی رولس رائس میں بیٹھا کر عبداللطیف جو راجا صاحب کا خاص ڈرائیور تھا آپ کو باغ میں لے جاتا۔ میں آپ کو گود میں لے لیتی تاکہ آپ سب لوگوں کو ہاتھ ہلا کر وش کریں۔

جب آپ چار سال کی ہوئیں تو رانی صاحبہ کے ساتھ سکندر آباد پریڈ گراؤنڈ جاتیں کرکٹ دیکھتے وہاں تین ٹنٹ ہوا کرتے تھے ایک مہاراجہ کا جہاں انگریز ریڈینڈنٹ سامنے بیٹھتے تھے اور ان کے تمام لوگ پیچھے کرسیوں پر بیٹھا کرتے تھے وسرا ٹنٹ نواب سالار جنگ بہادر کا اور تیسرا نواب معین الدولہ بہادر کا ایک اور ٹنٹ راجا دھن راج گیرجی کا ہوا کرتا تھا۔ راجہ صاحب کی ٹیم میں مہاراج کمار وجیانگرم یوراج آف پٹیالہ تھے جو دھن راج الوین میں کھیلنے آتے تھے کرنل سی کے نائیڈو مشتاق علی، دیودھر وغیرہ بھی دھن راج الیون میں کھیلتے تھے۔

ایک مرتبہ کرکٹرز کو آپ کی والدہ رانی صاحبہ نے ملنے کے لیے اندر بلوایا تھا تو میں ان کو اندر لے گئی تھی ''لی 14 ڈرائنگ روم میں انہیں ریسیو کیا گیا چائے وہیں Serve کی گئی۔ ایک صاحب نے کہا ایچ ای ایچ نظام نے بھی انہیں کال کیا تھا رانی صاحبہ نے ان سے پوچھا انہوں نے آپ کو بہت پسند کیا ہوگا۔ کہا سرکار نے میرے والد کو خط لکھا اور کہا کہ آپ شہزادے کو پھر حیدرآباد بھیجئے گا۔ رانی صاحبہ نے پوچھا کیا آپ نواب سالار جنگ بہادر، نواب معظم جاہ بہادر اور شہزادی نیلوفر سے بھی ملے ہیں تو ان سب لوگوں نے کہا راجا صاحب ہمیں وہاں ڈنر پر لے گئے تھے کسی نے ان سے کہا اتنا اچھا Reception ہمیں کہیں نہیں ملا۔ رانی

صاحبہ نے کہا آپ لوگ اکثر آیا کریں ہمیں خوشی ہوگی حیدرآباد اگر دور ہے تو ممبئی آجایئے۔انہوں نے کہا ہمیں بھی حیدرآباد آکر خوشی ہوتی ہے۔ٹیم کے ایک وہی صاحب جو بہت ہینڈسم تھے کہا آپ بھی موتی باغ تشریف لایئے ہمیں بھی خوشی ہوگی۔رانی صاحبہ نے مسکرا کر جواب دیا میں جب کپورتھلہ جاوں گی تو موتی باغ برابر رکنے جاوں گی۔اب تو جانہیں سکتی (مما اس وقت حمل سے تھیں) رانی صاحبہ نے کہا میں اکثر کرکٹ دیکھنے آتی ہوں۔ جب دھن راج الیون نے کپ اٹھایا تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔انہوں نے کہا ہم سبھوں نے اس میں شیمپن پی تھی پھران لوگوں نے اجازت مانگی وہ سب اٹھ کر جانے لگے تو سی کے نائیڈو نے ایک آیا سے گورنس کی یعنی میری طرف اشارہ کر کے کہا خوب صورت کلچرڈ اور پڑھی لکھی تعلیم یافتہ خاتون ہے۔

میں کیسے بھول سکتی ہوں وہ خوب صورت لمحے جب آپ بڑی ہورہی تھیں۔ جب میں انگلینڈ سے آپ کے پاس آئی تھی تو جوان تھی اب میرے بال سفید ہوگئے ہیں۔ جب کبھی آپ لندن آئیں تو مجھے پہلے سے ضرور اطلاع دیجئے میں آکر آپ سے ملنا چاہوں گی۔''

خط پڑھتے پڑھتے میں کئی بار رو پڑی۔ یہ خط ایک طرح کا دستاویز بڑا Magnetic بڑا دل کو چھو لینے والا اب میری زندگی بھی کئی موسموں سے گزر چکی ہے مگر میں نے طے کرلیا تھا کہ جب بھی لندن جاؤں گی ان سے ضرور ملوں گی وہ یقیناً تندرست تو ہوں گی یہ بہت پرانا خط تھا۔آج کل خط تو خواب بن گئے ہیں وہ دن بھی تھے جب لوگ اپنوں کے خطوط کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ پوسٹ مین کی آواز پر دوڑتے یا دوڑاتے دیکھو تو خط آیا ہوگا۔جتنی مرتبہ بھی خط پڑھیں لطف آتا ہی جاتا تھا تحریر کا جادو خطوں کی خوشبو چوم چوم کر رکھنے اور نکال نکال کر بار بار پڑھنے کا مزہ اب کہاں۔SMS اور Mail میں خطوں کی خوشبو، سحر انگیزی کہاں آسکتی ہے انہیں اٹھا کر کتابوں میں رکھا بھی تو نہیں جا سکتا۔خط زندگی کے ساتھ آدھی ملاقات کے رفیق ہوتے ہیں۔

میں نے پھر آگے خط پڑھا تھا'' مجھے ایک چھوٹی تصویر ملی ہے جس میں شاید آپ بھی ہیں۔ مجھے آپ کی صورت اچھی طرح سے یاد تو نہیں لیکن دل کہتا ہے اس تصویر میں آپ ہی ہوں گی ایک دھندلا سا تصور ہے آپ کا کیوں کہ آپ کے ساتھ میں نے تقریباً سات برس گزارے ہیں''۔

آگے خط میں لکھتی ہیں''رانی صاحبہ اور اینا فیضی کے ساتھ آپ کو سینٹ میری ہائی اسکول ممبئی میں لے گئی تھیں جہاں آپ کو نرسری میں داخلہ دیا گیا تھا اس وقت آپ ایک گلابی آرگنڈی کے فراک میں تھیں سفید جوتے تھے اور گلابی ربن خوب صورت بالوں میں لگایا گیا تھا۔اسکول آدھے دن کا تھا پلے گروپ تھا بیچ میں لنچ ٹائم ہوتا تھا۔ایک چھوٹے ٹیبل پر میں پلیٹ کانٹے اور چھری رکھ کر سلور ٹفن کریر کھولتی اور سلور چمچے سے ہی کھلاتی تھی ایک بچی سنیتا شروڈکر کو آپ کے ساتھ بٹھاتی تھی آپ دونوں ایک کلاس میں تھے سنیتا کا ایک گڈ لوکنگ بھائی شام میں آکر سنیتا کو اسکول سے لے جاتا تھا۔ میں نہیں سمجھتی کہ آپ نے انہیں دیکھا ہوگا آپ پہلی، دوسری اور تیسری کلاس پاس کرتی گئیں پھر پونے چلی گئیں اسی سال ممبئی کے اسکول میگزین میں آپ کی ایک فوٹو چھپی تھی۔ یہ بھی بتانا چاہوں گی کہ آپ حساب میں بہت کمزور تھیں مگر دوسرے مضامین میں Fairly Good تھیں پونے میں ایک دوسری کانونٹ میں گئیں وہاں سے حیدرآباد چلی گئیں اسی سال رانی صاحبہ کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی ان کے لیے گورنس نہیں بلکہ ایک Nanny آئی تھی۔ ہم راجہ صاحب کے سیلون میں حیدرآباد پہنچے آپ کے وہاں بہت سے دوست تھے۔علی خسرو جنگ آپ کی چھوٹی بہن کی ہم عمر تھی۔آپ لوگ لان پر کھیلتے تھے میرے پاس ایک اور تصویر ہے آپ کی وہ Children Party کی تصویر ہے۔

سفرنامہ

آوارگی تھوڑی سی (آخری قسط)

کولکتہ کے لئے پٹنہ سے ٹرین کا سفر طے پایا، اچھا لگا کہ دو دہائیوں کے بعد ریل گاڑی میں طویل سفر کا موقع ملے گا۔ ٹرین کا سفر ہمارے لئے یوں بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ سچے اور اچھے دوست انہی راستوں میں ملے ہیں، اور ہماری زندگی کا اہم مخلص دوست افسر فہیم ہمیں اسی گزرگاہ میں دستیاب ہوا، جن کی دوستی پر ہمیں آج بھی فخر ہے کل بھی خوشی تھی۔ اس دفعہ سفر میں ایک بڑا قافلہ ہمسفر رہا جس میں خواتین وحضرات شامل تھے۔ پلیٹ فارموں پر لمبا راستہ طے کرنے کے بعد ہم لوگ اس جگہ پہنچے جہاں کولکتہ کی ٹرین آنی تھی۔ ابھی کچھ دیر انتظار کرنا تھا سو پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے تھکاوٹ کا احساس ہوا تو وہیں ایک درخت کے اطراف خاصی چوڑی دیوار تھی جس کی منڈیر پر بیٹھنے ہی میں ہمیں عافیت نظر آئی کہ گھٹنے لمبے راستے طے کرنے کے سبب جواب دے رہے تھے، میری داہنی جانب وفا یزدان بھی بیٹھ گئیں خواتین تو ویسے بھی جلد تھک جاتی ہیں انہیں دیکھ کر صدف میری بائیں جانب آ کر بیٹھ گئیں۔ شہاب الدین احمد یہ منظر بڑے غور سے دیکھ رہے تھے انہیں شرارت سوجھی اور فوراً تصویریں بنانے لگے جس میں دونوں خواتین میرے آس پاس بیٹھیں تھیں اور اعلان کیا کہ یہ فوٹو زجدہ جانے والی ہیں۔ گویا ہمیں دھمکی دی جارہی تھی سب لوگ ہنس پڑے تو ہم بھی ان کی ہنسی میں شامل ہوگئے کہ ہنسنے کے مواقع آج کے ماحول میں ملتے ہی کم ہیں۔ پروفیسر اعجاز ارشد بھی ساتھ تھے وہ وفا یزدان سے گفتگو پر زیادہ دھیان دے رہے تھے اور وفا کو شعری رموز ونکات سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے خواہش کررہے تھے کہ آپ اپنا کلام ہمیں بھیج دیں بات ہمارے آپ کے درمیان ہی رہے گی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے دخل درمعقولات کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ وفا کو کسی کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے ماشاللہ وہ شاعری پر دسترس رکھتی ہیں یہ سن کر اعجاز ارشد کو ہوسکتا ہے اچھا نہ لگا ہو پھر بھی موصوف نے فرمایا کہ خوب سے خوب تر کی گنجائش تو ہوتی ہی ہے! بات معقول تھی اس لئے ہمیں چپ ہونا پڑا ۔ رات کا سفر تھا سوار ہوتے ہی کچھ دیر بعد سب اپنی اپنی برت پر دراز ہوگئے وسیلہ کے ایڈیٹر محمود شاہد بھی میرے قریب ہی بیٹھے تھے ان کا ہمارا کافی پرانا تعلق سعودی عرب میں ان کے قیام کے دوران رہا تھا اگرچہ وہ اب اپنے وطن عزیز لوٹ گئے ہیں، سو گفتگو کا موقع ملا مگر کچھ ہی دیر میں خاموشی کے ساتھ آرام کر لینے کی خواہش کا اعلان ہوا۔ جب جاگے تو میں، شہاب الدین، وفا یزدان اور پروفیسر صفدر امام قادری ایک ہی سیٹ پر بیٹھے تھے وفا کو اپنا وعدہ غالباً یاد آ گیا اور انہوں نے اپنے بیگ سے ایک بڑی تھیلی نکالی جس میں سوکھا میوا بادام وغیرہ تھے۔ سب کے سامنے رکھتے ہوئے دعوت دے ہی رہی تھیں کہ صفدر امام قادری صاحب نے جھپٹ کر وہ تھیلی ان سے لے لی کہ یہ ہمیں دے دیں وہ ایسے جھپٹے جیسے لہو گرم رکھنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا ہو۔ ویسے بھی علم وادب کی دنیا کے اس درویش کو کیا کہا جاسکتا تھا سو ہم سب نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ ریل گاڑی کا یہ سفر اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود یادگار اور پرلطف رہا۔ تقریباً ۹ گھنٹے سفر کرنے کے بعد ہم کولکتہ کے اسٹیشن پر پہنچ گئے جہاں سے ہمارے قافلے کو پہلے ایک عالی شان ہوٹل میں ٹھہرایا گیا جس کے مالک جناب جمیل منظر ایڈیٹر سہیل میگزین ہمارے میزبانوں میں شامل تھے۔

کولکتہ اس لئے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ کولکتہ یعنی مغربی بنگال میں پیدا ہونے والے مشہور لوگوں میں مصلح قوم و

ہندو مذہب راجہ رام موہن رائے جنہوں نے اپنی اصلاحات کے دوران ستی جیسی غیر انسانی رسم کا خاتمہ کیا تھا اور قومی ترانہ جنا منا گنا کے خالق رابندناتھ ٹیگور، جسے ہم نے اسکولوں میں برسہا برس پڑھا ہے مگر سمجھنے یا سمجھانے کی ضرورت پر کبھی کوئی لکچر یا سبق نہیں دیا جاتا تھا، ان کے علاوہ محمد حامد انصاری سابقہ نائب صدر جمہوریہ، پرنب مکرجی سابقہ صدر جمہوریہ سب اسی زرخیز علاقے کی پیداوار تھے۔ کولکتہ میں لگتا ہے کہ بہار کے بے شمار خاندان جا بسے ہیں جس کے سبب ہمیں کہیں بھی بنگلہ سننے کا موقع نہ ملا ویسے بھی چوبیس گھنٹے کے قیام میں مل بھی کیسے سکتا تھا سوائے اس اجلاس کے جس میں ایک مقامی مقالہ نگار مقالہ پیش کرتے ہوئے بنگلہ بول رہے تھے اور ہمیں جدہ میں رہتے ہوئے ''کیمون آسن بھالو آسن تڑا تڑی کرین ماس بھات'' اتنے ڈھیر سارے بنگلہ کے جملے یاد تھے پھر بھی کچھ ہمارے پلے نہ پڑ سکا تھا۔ ڈاکٹر احمد سجاد پر نظر پڑی تو ماضی کے جدہ میں منعقدہ پروگرام یاد آ گئے ان سے ملاقات کر کے جدہ میں ۱۹۹۰ یا اس سے بھی پہلے کی دہائی میں انکی آمد کا ذکر کیا موصوف بہت خوش ہوئے اور فرمایا کیا آپ کو اب تک یہ سب کچھ یاد ہے، میں نے جی میں کہا مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو ماضی کے کلکتہ یا آج کے کولکتہ میں موجود فورٹ ولیم کالج کی تاریخی حیثیت قیام اور خدمات کے سلسلے میں کچھ عرض کرتا چلوں تا کہ نئی نسل تک اس کا تعارف پہنچ سکے، ہم ماضی میں جی کر پدرم سلطان بود کہنے کے قطعی قائل نہیں مگر اپنے تہذیبی اثاثے سے رشتے بھی توڑ نہیں سکتے کہ اس سے ہمارے حال اور مستقبل کو روشن رکھنے کی کوششیں رائگاں نہیں جائیں گی۔

۱۷۹۸ میں جب لارڈ ولزلی ہندوستان کا گورنر جنرل بن کر آیا تو یہاں کے نظم ونسق کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ انگلستان سے جو نئے ملازمین کمپنی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے یہاں آتے ہیں وہ کسی منظم اور باقاعدہ تربیت کے بغیر اچھے کارکن نہیں بن سکتے۔ لارڈ ولزلی کے نزدیک ان ملازمین کی تربیت کے دو پہلو تھے ایک ان نوجوان ملازمین کی علمی قابلیت میں اضافہ کرنا اور دوسرا ان کو ہندوستانیوں کے مزاج اور ان کی زندگی کے مختلف شعبوں ان کی زبان اور اطوار طریقوں سے واقفیت دلانا تھا۔ پہلے زبان سیکھنے کے لئے افسروں کو الاونس دیا جاتا تھا لیکن اُس سے کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے تھے۔ اس لئے جب لارڈ ولزلی نے یہ ضروری سمجھا کہ انگریزوں کو اگر یہاں حکومت کرنی ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ کمپنی کے ملازمین کا مقامی زبانوں اور ماحول سے آگاہی کے لئے تعلیم وتربیت کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ ان وجوہات کی بنا پر ولزلی نے کمپنی کے سامنے ایک کالج کی تجویز پیش کی۔ کمپنی کے کئی عہداروں اور پادریوں نے اس کی حمایت کی۔ اور اس طرح جان گلکرسٹ جو ہندوستانی زبان پر دسترس رکھتے تھے۔ کمپنی کے ملازمین کو روزانہ درس دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور لارڈ ولزلی نے یہ حکم جاری کیا کہ آئندہ کسی سول انگریز ملازم کو اس وقت تک بنگال، اڑیسہ اور بنارس میں اہم عہدوں پر مقرر نہیں کیا جائے گا جب تک وہ قوانین وضوابط کا اور مقامی زبان کا امتحان نہ پاس کر لے۔ اس فیصلے کے بعد گلکرسٹ کی سربراہی میں جنوری ۱۷۹۹ میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ جو بعد میں فورٹ ولیم کالج کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ کچھ مسائل کی وجہ سے اس مدرسے سے بھی نتائج برآمد نہ ہوئے جن کی توقع تھی۔ جس کے بعد لارڈ ولزلی نے کالج کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا۔

فورٹ ولیم کالج مغربی طرز کا پہلا تعلیمی ادارہ تھا جو لارڈ ولزلی کے ہی حکم پر سن ۱۸۰۰ئمیں قائم کیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے۔ اردو نثر کی تاریخ میں خصوصاً یہ کالج سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر چہ کالج کا قیام انگریزوں کی سیاسی مصلحتوں کے تحت عمل میں آیا تھا تا کہ انگریز یہاں کی زبان سیکھ کر رسم ورواج سے واقف ہو کر اہل ہند پر مضبوطی سے

حکومت کرسکیں۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فورٹ ولیم کالج شمالی ہند کا وہ پہلا ادبی اور تعلیمی ادارہ ہے جہاں اجتماعی حیثیت سے ایک واضح مقصداور منظّم ضابطہ کے تحت ایسا کام ہوا جس سے اردو زبان وادب کی بڑی خدمت ہوئی اور اس کالج نے اردو زبان کے نثری ادب کی ترقی کے لئے نئی راہیں کھول دیں۔

چھبیس مارچ بروز اتوار صبح دس بجے جناب جمیل منظر کی عالی شان ہوٹل میں قیام کے کچھ دیر بعد ہمیں عالیہ یونیورسٹی جانا تھا جہاں بزم صدف اور اشرف ایجوکیشنل سوسائٹی کا مشترکہ پروگرام طے تھا۔ کہتے ہیں کہ بنگال کی صوبائی حکومت نے اپنے زیر انتظام کولکتہ کی ایک اقلیتی درسگاہ محمڈن کالج کو ۲۰۰۸ میں عالیہ یونیورسٹی کا درجہ دیا۔ سو پروگرام عالیہ یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں تھا جہاں افتتاحی پروگرام کی صدارت جاوید دانش کے سپرد تھی جبکہ قطر سے تشریف لانے والے عمران اسد سمیع اللہ اسد کے صاحبزادے نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت فرمائی۔ شہاب الدین احمد نے تعارفی کلمات اور صفدر امام قادری نے پہلے اجلاس کے لئے اظہار تشکر فرمایا۔ اسکے بعد متصلا ہی دوسرا پروگرام ہوا۔ عالیہ یونیورسٹی کا آڈیوٹوریم عالی شان اور وسیع ہونے کے باوجود شرکا اور حاضرین کی تعداد تقریبا نصف ہال کا علاقہ پر کرسکی تھی۔ اس میں بھی مستقل بیٹھ نہیں رہے تھے آنے جانے کا سلسلہ چل رہا تھا۔ سمینار کا عنوان پروفیسر سمیع اللہ اسد کی علمی وادبی خدمات تھا۔ حسب معمول پر مغز مقالے پڑھے گئے جن سے سمیع اللہ اسد کی علمی اور ادبی خدمات کا اندازہ ہوا۔ اس کے بعد جاوید دانش اپنے پروگرام داستان گوئی کا تام جھام لئے رونما ہوے اور روایت کے مطابق ان کی داستان گوئی بہت پسند کی گئی اور پھر ایک بین الاقوامی مشاعرہ ہوا جس کی نظامت ڈاکٹر میرے پسندیدہ ناظم ڈاکٹر زاہد الحق نے اپنے منچلے انداز میں فرمائی۔ مہمان شعرا میں احمد اشفاق، ندیم ماہر جاوید دانش وفایز دان کے علاوہ صدف اقبال بھی شامل تھیں صدف نے معمول سے زیادہ رومانٹک کلام پیش کیا اور وہ بھی نوری صاحب کی نذر کرتی رہیں، ہال میں تھوڑی دیر کے لئے سماں سا بندھ گیا (یا ہلچل سی مچ گئی)۔ ابوذر ہاشمی بھی کولکتہ میں مقیم ہیں اور پروگرام کے منتظمین میں سمیع اللہ اسد کے صاحبزادگان کے ساتھ شامل رہے۔ موصوف سے پٹنہ میں ملاقات ہو چکی تھی اور ازراہ کرم انہوں نے ہماری طرحی غزل مشاعرے سے پہلے سنی تھی اور ایک لفظ کی تبدیلی کا مشورہ بھی دیا تھا۔ ہم ان کے ممنون ہیں، بزم صدف نے حسب روایت یہاں بھی تقریبا بیس کتابوں کی رسم اجرا کا اہتمام کیا، عقل دنگ تھی کہ جہاں ایک کتاب کی اشاعت کارنامہ سمجھی جاتی ہو وہاں بزم صدف اتنا بڑا ذمہ لے کر کتابیں شائع کر رہی ہے۔

پروگرام کے اختتام پر رات میں فیس بک کھولی تو شہناز رحمت کا میسج ملا کہ ہم نے آپ کو پروگرام میں دیکھا ہے، فیس بک کے دوستوں میں کون کہاں سے تعلق رکھتا ہے ہم نے کبھی اس کی تحقیق نہیں کی اس لئے اندازہ نہیں ہوا کہ محترمہ کولکتہ میں ہوتی ہیں۔ بہرحال انہوں نے بتایا کہ انہیں جلدی تھی اس لئے وہ آخر تک نہیں رک سکیں اور مجھ سے ملاقات نہ کرسکیں بہرحال اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں ہم نے مزاحاً کہا ابھی آجائیں ہوٹل تو ملاقات ہوسکتی ہے، رات کافی گزر چکی تھی اور ان کا تنہا آنا مشکل اور غیر مناسب بھی تھا سو وہ نہیں آسکیں۔

دوسرے دن صبح ہم ہوٹل سے نکلے تو عمران اسد کے دولت خانے پر دوپہر کے کھانے کا انتظام ہوا اور بنگال کی خصوصی ڈشوں سے میزبانی کی گئی۔ ڈاکٹر احمد سجاد سے مزید گفتگو اور ان کی صحبت سے استفادے کا موقع بھی ملا۔ پھر شام ہوتے ہوتے سب لوگ اپنے اپنے ائرپورٹ پہنچ رہے تھے ہمیں بھی حیدرآباد کی فلائٹ لینی تھی سو ائرپورٹ پہنچے اور اس پورے ثقافتی سفر میں پہلی مرتبہ سب کو چھوڑ چھاڑ کر تنہا جانا تھا اور وہ بھی اپنے وطن حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی طرف۔ شہاب الدین احمد کی قیادت میں چلنے والے

اس قافلے کی یہ آخری منزل تھی مگر جاوید دانش نے حیدرآباد آنے کا وعدہ کرلیا اور پھر وہ دلی وغیرہ کی طرف چلے گئے اور زاہد الحق بھی حیدرآباد روانہ ہوے۔

حیدرآباد میرا اپنا شہر ہے جہاں میری بے شمار یادیں بستی ہیں (زمین کے اوپر بھی زمین کے اندر بھی) جہاں میں نے تربیت پائی جہاں تعلیمی مراحل سے گزرا، جہاں اپنے ابتدائی مشاعرے پڑھے جن اساتذہ کی نگرانی میں اپنا کلام سنانے کا موقع ملا ان میں سعید شہیدی، خیرات ندیم، علی احمد جلیلی اوج یعقوبی راز عابدی، سعادت نذیر، سرپٹ حیدرآبادی، منوہر لال بہار وغیرہ شامل ہیں بزم جوہر ادب سے انجمن احباب دکن تک دیگر انجمنوں میں بھی اساتذہ کی محافل میں بیٹھا اٹھا، سبھی لمحے قیمتی تھے۔ خلیجی ممالک میں رزق کے دروازے کھلنے کے بعد ایک عام رجحان بن گیا تھا جسے بطور مذاق ''دوبئ چلو'' بھی کہا جاتا تھا اور وہ شعر بھی اکثر بڑوں چھوٹوں کو دہراتے سنا تھا ''وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا۔ عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا''

جس شہر کو میں نے معاشی ہجرت کے طور پر ۱۹۷۸ میں چھوڑا اور دو چار برس بعد آتا جاتا بھی رہا تھا مگر سترہ برس پہلے جب آخری بار خیر باد کہہ رہا تھا تو اس کا علم نہیں تھا کہ اتنا عرصہ وطن سے دور رہوں گا بہرحال آج پھر اسی مٹی پر کھڑا ہوں۔ کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی۔ یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا کے مصداق تاخیر کی تفصیلات سب کے لئے دلچسپی کا باعث نہیں ہوں گی بہرطور ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا، ائرپورٹ سے سیدھے گھر پہنچا، گھر والی پہلے سے گھر میں موجود تھی دو تین دن بعد اسے جدہ جانا ضروری تھا کہ ایگزٹ ری انٹری ویزا کی مدت پوری ہورہی تھی ایسے میں ناگواری کا اظہار فطری امر تھا سو چپ چاپ دو تین دن گھر کی بلکہ فلیٹ کی چار دیواری میں گزارنا وقت کا اہم تقاضا تھا۔ اس آمد سے کچھ ہی دن پہلے تو میں ایک اہم عزیز کی شادی میں ایک ہفتہ کے لئے وطن آیا تھا، تب ہی سے رکنا چاہتا تھا کہ تقاریب کے سلسلے چلتے رہے اور شہر کی سیر کا کوئی خاص موقع نہ ملا تھا، مگر دیگر اہل خانہ کا خیال تھا کہ جب کچھ دن بعد آنا ہی ہے تو واپس ہمارے ساتھ چلئے پھر کانفرنس کی تاریخوں میں دلی چلے جانا اور اپنا وقت گزار کر آجانا۔ بہرحال تین دن بعد جب راوی نے چین لکھا تو میں نے احباب سے رابطہ کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ گزشتہ دنوں شادی کی تقریب میں نے اپنے اکثر موقر احباب کو مدعو بھی کیا اور سوائے دو تین کے سب ہی نے شرکت کی اور ملاقات کا شرف بخشا تھا۔ شریک ہونے والوں میں سردار سلیم، آغا سروش، سردار اثر، گواہ کے ایڈیٹر فاضل حسین پرویز وغیرہ شامل تھے اور طاہر رومانی اپنی مشغولیت کے سبب نہ آسکے جبکہ اسلم فرشوری صاحب نے وعدہ تو کیا مگر تشریف نہیں لاسکے۔ فاضل حسین پرویز کو جب دعوت دینے کے لئے فون کیا تو موصوف نے بتایا کہ ان دنوں ڈاکٹر اوصاف سعید سابق کونسل جنرل ہند جدہ شکاگو میں اپنی سفارت کی مدت پوری فرما کر اگلی پوسٹنگ پر جانے سے پہلے وطن آئے ہوے ہیں فون پر اسی وقت بات ہوئی میں نے انہیں دعوت دی تو پتہ چلا کہ اسی دن فاضل حسین پرویز کی کتاب کی رسم رونمائی ہے جس میں اوصاف سعید صاحب نے مجھے بھی شرکت کا حکم دیا سو میں گھر کی دعوت سے پہلے اس امید پر وہاں چلا گیا کہ واپسی میں اوصاف سعید صاحب کو بھی لیتا آوں گا رسم کی تقریب پوری ہوئی اوصاف سعید سے درخواست کی تو موصوف نے اپنی شدید مصرفیات کا ذکر کر کے معذرت چاہتے ہوے دوسرے دن اپنے دولت خانے پر آنے کی دعوت دی بہرحال ان کی مصروفیات میں مخل ہونا مجھے مناسب نہیں لگا اور میں دوسرے دن بھی ان سے ملاقات کے لئے نہیں جاپایا۔ ان کے علاوہ کچھ اسکول اور کالج کے ساتھیوں کو مدعو کرلیا تھا کہ ایک وقت میں ملاقات کا یہ سنہرا موقع تھا چند دوست جو وطن میں رہ گئے تھے وہ بھی آگئے اس طرح گزشتہ آمد پر ہی سب کو

میری دوبارہ آمد کا علم تھا۔ دادھیال اور ننھیال کے تقریبا تمام باقیات الصالحات سے ملاقات ہوئی تھی اس لئے اس دفعہ کہیں اور جانے کا لزوم سر پر نہیں تھا۔

یہ تاریخی شہر، ایک روایت کے مطابق اردو کے پہلے صاحب دیوان محمد قلی قطب شاہ کا حیدرآباد دکن، ان کی اہلیہ بھاگ متی سے بھاگیہ نگر بنا پھر انہیں حیدر محل کا خطاب عطا ہونے کے بعد انہی کے نام سے موسوم ایک خوبصورت بستی کا نام ہے۔ چار مینار آصف جاہی کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی قلعہ گولکنڈہ کا شہر ہے۔ اس دارالترجمہ کا شہر ہے جس نے اردو ترجموں کی تاریخ میں ایک سنہرا باب رقم کیا ہے، یہاں تک کہ پیشہ ورانہ تعلیم کا ذریعہ تدریس بھی اردو ہی قرار پایا تھا۔ اگر یونانی میڈیکل کالج میں اردو میں تعلیم دی جاے تو بڑا کارنامہ نہیں مگر کمال تو یہ ہے کہ ایم بی بی ایس کی تعلیم بھی اردو میں دی گئی ''گریز اناٹومی'' جیسی ضخیم کتاب کا اردو میں ترجمہ مثال کے طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے مگر افسوس کہ یہ سارے ذخائر کچھ سرکاری عدم توجہی کے سبب اور کچھ اہل اردو کی عدم دلچسپی کے باعث باقی نہ رہ سکے۔ جامعہ عثمانیہ کے بعد اب تو کئی اہم جامعات نے سرزمین حیدرآباد کو رونق بخشی ہے جس میں حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

قلی قطب شاہ کی دعا کہ ''میرا شہر لوگاں سے معمور کر'' کا اثر ہے ہمیشہ یہ بستی دنیا بھر کے سیاحوں کی دلچسپی کا باعث اور پریشان حال باشندوں کا مسکن بنی ہے ہے ہندوستان کے کئی صوبوں سے لوگ آکر بستے رہے اور آبادی بڑھتی رہی۔

آج کا حیدرآباد ہندوستان کی حالیہ منقسم جنوبی ریاستوں آندھراپردیش اور تلنگانہ کا مشترکہ دارالخلافہ ہے۔ حیدرآباد نہ صرف اپنی گنگا جمنی تہذیب اور اپنی سنہری تاریخ کے لئے مشہور ہے بلکہ اسے شہر مہر ومحبت بھی کہا جاتا ہے، یہی وہ شہر ہے جسے موتیوں اور مسلمان نوابوں اور بادشاہوں کا شہر بھی کہا جاتا رہا ہے نظام کے دور حکومت میں دارالسلطنت رہا جبکہ نظام دکن نے حیدرآباد کے ہندو اور مسلمانوں کو اپنی دو آنکھوں سے تعبیر کیا تھا، مہاراجہ کشن پرشاد کا نواب میر عثمان علی خان کی سلطنت میں وزیراعظم ہونا اس کی خوبصورت دلیل بھی مانی جاسکتی ہے اسی لئے شہر فرخندہ بنیاد، شہر محبت کل بھی تھا اور آج بھی بلا لحاظ مذہب وملت اردو تہذیب، تمدن، روایات کا ادبی وثقافتی مرکز سمجھا جاتا ہے۔ آج بھی مکہ مسجد، سالار جنگ میوزیم، قلعہ گولکنڈہ، چو محلّہ پیلس، گگن محل، قطب شاہی مقبرے، جامعہ عثمانیہ، کتب خانہ آصفیہ، ہائی کورٹ، عثمانیہ دواخانہ، فلک نما پیلس، حسین ساگر اور باغ عام جیسی تاریخی یادگاریں سطوت وعظمت کی نمائندہ ہیں تو، ہائی ٹیک سٹی، راموجی فلم سٹی جیسے جدید سائنسی علوم کے شاندار نمونے بھی حیدرآباد ہی میں پاے جاتے ہیں۔

گزشتہ آمد پر محترمہ تسنیم جوہر نے گھر پر مدعو کیا جہاں امریکہ سے خواجہ کمال الدین صاحب کی حیدرآباد آمد کی اطلاع دیتے ہوے ان کی تشریف آوری کی خبر بھی دی سو میں شام کے وقت تسنیم جوہر کے دولت خانے پر پہنچ گیا۔ کچھ ہی دیر میں خواجہ کمال الدین اور خواجہ نصیرالدین صاحبان بھی پہنچ گئے تھے خواجہ کمال صاحب سے کسی وقت جدہ میں ایک آدھ ملاقات ذہن میں تھی باقی آن لائن رابطہ کافی عرصہ سے قائم تھا۔ پرانی یادیں اور ادبی وغیرادبی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی دو مرتبہ چاے کا دور چلا بسکٹوں وغیرہ سے بھی تواضع کی گئی جبکہ تسنیم جوہر صاحبہ اپنی میزبانی میں کہیں چل کر کھانے کی بھی دعوت دیتی رہیں مگر وقت نہیں تھا کہ کھانا بھی کھایا جاتا اس لئے معذرت کرلی گئی۔ وہاں ایک اور خاتون سے بھی ملاقات ہوئی جو کسی بڑے بنک کی آفسر بتائی گئی ان کا تعلق کیرلا سے تھا یعنی وہ ملیباری تھیں مگر ان کی اردو خدا کی پناہ! ہم نے بہت سے ملیباری جدہ میں ایسے دیکھے جو اردو بولتے اور

سمجھتے ہیں مگر ایسا ملیباری نہیں دیکھا جو اردو نہ صرف لکھنا پڑھنا جانتا ہو بلکہ اردو میں شعر بھی کہتا ہو۔ بزم شعر سجی سننا سنانا ہوا اور آخر میں محترمہ مونالیزا نے جن کا یہ قلمی نام ہے، اپنا شعری مجموعہ بھی از راہ عنایت مجھیا ور دیگر مہمانوں کو عطا فرمایا، بہت خوشی ہوئی کہ اردو نے کس کس کو اپنی زلفوں کا اسیر کیا ہے۔ تسنیم جوہر کی ایک بزم خواتین بھی ہے اور اس انجمن کے زیر اہتمام کملا نہرو پالی ٹکنک کے آوڈیٹوریم میں مشاعرہ خواتین ہونے والا تھا جبکہ نمائش میدان سالانہ صنعتی نمائش کے آخری ایام سے گزر رہا تھا۔ اس مشاعرہ خواتین میں تسنیم جوہر نے خواجہ کمال الدین اور مجھے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی دعوت دی سو ہم بھی شریک ہو گئے۔ صدارت ایک پروفیسر صاحبہ کی تھی جنہیں اردو سے کوئی خاص شغف نہیں تھا مگر دلچسپی اور محبت تھی کہ وہ پورے خلوص سے شریک ہوئیں اور صدارتی کلمات سے بھی نوازا۔ شاعرات کی اچھی خاصی تعداد تھی جن میں نوآموز بھی ایک دو تھیں باقی پختہ فکر اور کہنہ مشق نظر آرہی تھیں۔ ان میں صرف ایک نام جو تسنیم جوہر کے علاوہ مانوس تھا وہ حنا شہیدی کا تھا۔ نظامت تسنیم جوہر کے جواہر نظامت کی آینہ دار تھی۔ مہمانان خصوصی کی گلپوشی بھی کی گئی اور اظہار خیال کا موقع بھی دیا گیا۔

ایک دن پروفیسر مجید بیدار کو فون کیا اور ملاقات کی خواہش کی تو وہ خود چلے آے مجید بیدار پرانے دنوں کی یادگار ہیں جس وقت ہم لوگ ایک ساتھ انجمن احباب دکن کے مشاعروں اور ادبی اجلاس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ راے محبوب نارائن کی شفقت بھری نظریں آج بھی یاد آتی ہیں بڑے خلیق انسان اور خوبصورت نثر نگار تھے۔ روایتی قدروں کے مالک تھے ان کے مکان میں فارسی اور اردو اشعار کے طغرے سجے ہوے ہوتے اور ایک تخت پر سب آنے والے بیٹھ کر ان سے مستفید ہوتے تھے، ان کے ایک بیٹے کا نام غالبا اقبال نارائین تھا۔ میری وضع قطع کو دیکھ کر ایک دفعہ راے محبوب نارائن نے قرآن کا ایک نایاب نسخہ مجھے دکھاتے ہوے کہا ''دیکھئے مولانا ہم کافروں کے پاس بھی کیا کیا کچھ ہے'' واقعی بہت بڑی سائز کی قرآن شریف تھی جس میں اردو ترجمہ اور حاشیہ بہت تفصیل سے درج تھے۔ برادر محترم مجید بیدار تشریف لاے اور شرف ملاقات بخشا کچھ دیر غریب خانے پر بیٹھے رہے پھر اطلاع دی کہ ڈاکٹر صادقہ نواب آئی ہوئی ہیں ان سے ملنے جانا ہے، مجھے خوشی ہوئی کہ وہ حیدرآباد میں ہی ہیں میں بھی صادقہ نواب سے ملنے بیدار صاحب کے ساتھ چل پڑا۔ صادقہ نواب جدہ آئی تھیں ان کے اعزاز میں اردو گلبن کے زیر اہتمام ایک شام منائی گئی تھی ان کے شریک حیات نواب صاحب بھی بہت نفیس طبیعت کے مالک ہیں۔ آج پھر ان سے ملاقات ہوئی تو وہ دونوں بھی بہت خوش ہوئے۔ پروفیسر مجید بیدار اپنی تدریسی مصروفیات میں اکثر شہر سے باہر ہوتے ہیں اس لئے ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہوسکی۔ نجیب احمد نجیب نے اطلاع دی کہ جناب علی نثار کی بیٹی کی شادی ہے اور ایک مشاعرہ بھی ہونے والا ہے آپ شرکت کی طمانیت دیں تو آپ کو مہمان خصوصی بنانا چاہتے ہیں دیگر یہ کہ باہر سے بھی شعرا کی شرکت متوقع ہے۔ میں نے حامی بھر لی مگر فورا سفر کے پیش نظر اس محفل میں شریک نہ ہوسکا تھا جس میں صدف اقبال پٹنہ سے آرہی تھیں۔ نجیب نے بتایا کہ صدف کو جب میری آمد کی اطلاع ملی تو بہت خوش ہوئیں۔ نجیب کو حیرت تھی کہ اس قدر والہانہ خوشی کا کیا سبب ہے، مجھے بھی خود اندازہ نہیں تھا بس اللہ اگر چاہنے والوں کے دل میں محبت ڈال دے اس پر کسی کا کیا اختیار ہو سکتا ہے۔ بہرحال میں فروری کے وسط میں ہی جدہ واپس آ گیا تھا اور مارچ کی ۳۱ کو پھر دلی کا سفر درپیش تھا۔ عرصہ دراز سے ان لوگوں کی زبانی جو شہر محبت کو آتے جاتے تھے بڑی تعریفیں سنی تھیں کہ ''آپ شہر جائیں گے تو شاید پہچان نہ پائیں سڑکیں اور محلے اتنے بدل گئے ہیں شہر کافی ترقی کر چکا ہے وغیرہ وغیرہ'' اور جب میں پہنچا

تو یاد آیا کہ میں نے غالباً کسی کی زبانی مشتاق احمد یوسفی کی یہ کہانی سنی، جب مشتاق احمد یوسفی چالیس سال بعد کراچی سے ہندوستان اپنے وطن عزیز پہنچے تو ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا عزیزوں کی جانب سے اور انہیں وہ گھر دکھایا گیا جسے وہ چھوڑ کر ہجرت کر گئے تھے، مکان دیکھا تو موصوف پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، لوگوں نے تسلی دی تو فرمایا میں اس لئے نہیں رو رہا ہوں کہ یہ مکان چھوٹ گیا ہے بلکہ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ کیا چالیس برس تک میں اسی مکان کے لئے رو رہا تھا؟ یہ واقعہ ان کی اکثر کتب کے مطالعے کے باوجود میں نے خود نہیں پڑھا ہے پھر بھی ایسا لگا یہ قصہ اس وقت مجھ پر اور میرے سفر پر صادق آ رہا ہے شہر سے محبت اور زمین سے تعلق اپنی جگہ مگر جتنے دن مجھے باہر گھومنے کا موقع ملا حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، مانو یعنی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، اردو ہال وغیرہ، یونیورسٹی کے اندر تو بہت بھلا لگا مگر باہر کے حالات بشمول ناملی اور پرانے شہر کے وہ محلے جہاں عزیز اب بھی رہتے ہیں مثلاً چنچل گوڑہ، شکر کوٹھا، گلزار حوض، چار مینار، سعید آباد کرما گوڑہ وغیرہ اکثر جگہوں کا حال سوائے چند پلوں کی تعمیر کے کچھ اچھا نہ لگا۔ خصوصاً پرانے شہر میں کل جس گلی سے رکشا گزرتا تھا آج اس راستے سے سائکل گزرنا محال ہے۔ سڑکوں کی دونوں جانب اکثر ٹھیلے اور چھوٹی موٹی دکانیں نظر آئیں جو اجازت کے بغیر بنائے جانے کی چغلی کر رہی تھیں۔ ٹرافک پولیس کا نظام سخت ہونے کے باوجود بائیکوں یعنی موٹر سائکلوں پر سوار لوگ اسقدر ہارن مارنے کے عادی ہو گئے اور سڑکوں پر چلنے والے انہیں سننے کے عادی کہ اگر ایسا دیگر ملکوں میں ہو تو لوگ بلڈ پریشر کے مریض ہو جائیں خصوصاً سعودی عرب میں ہارن مارنا کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا عموماً شریف لوگ ایک آدھ دفعہ سے زیادہ ضرورتاً بھی ہارن نہیں بجاتے۔ ڈاکٹر روف خیر نے اطلاع دی کہ اردو ہال میں بیاد مخدوم ایک مشاعرہ ہے آپ بھی پہنچیں میں بھی آ رہا ہوں، ان کے ارشاد پر میں تو پہنچ گیا میرے لڑکے سہیل نے اپنی نئی کلینک میں مصروفیت کے سبب اپنے دوست ڈاکٹر عظیم صدیقی کے ذریعے پہنچانے کا انتظام کیا اور وہ اپنی بڑی جیپ میں وہاں پہنچا کر کچھ دیر بیٹھے پھر اجازت لے کر واپس آ گئے کہ نئی نسل کو مشاعروں سے دلچسپی یوٹیوب کی حد تک رہ گئی ہے ایسا نہیں ہے کہ نعیم صدیقی جو کبھی عرصہ دراز تک جدہ میں مقیم رہے اور ان کے صاحبزادے عظیم کو اردو سے دلچسپی نہیں ہے بلکہ جیسا باپ ویسا بیٹا کے مصداق باپ بیٹے دونوں ہی خدمت خلق اور اپنی محبتوں کے لئے پہنچانے جاتے ہیں مگر اردو کے لئے اتنا وقت دینا شاید سب کے بس کی بات نہیں رہی، بہرحال روف خیر کو مکتب عشق مانو میں سبق یاد کرنے کی پاداش میں چھٹی نہ مل سکی یا کام کے سبب فرصت نہ ملی۔ اردو ہال میں پروفیسر رحمت یوسف زئی کے علاوہ رحمٰن جامی شناسا تھے اور ایک شخص لگ رہا تھا کہ بہت دیکھا ہوا ہے مگر اس کی جسمانی ساخت اتنی عجیب ہو گئی تھی کہ پہچاننے میں دشواری ہوئی اور یہ شخص کامریڈ جہاندار افسر کا لڑکا جو اب لڑکا نہ رہا تھا تجمل اظہر تھا، اس نے خود بڑھ کر اپنا تعارف کروایا تو یاد آیا کہ موصوف کے ساتھ بھی کئی مشاعرے ہم نے ابتدائی زمانے میں پڑھے تھے۔ یاد مخدوم کی اس نشست میں بہت عرصہ بعد اردو ہال حمایت نگر، دیکھنا نصیب ہوا یہی وہ جگہ تھی جس کے کسی گوشے میں پروفیسر حسینی شاہد اردو اورینٹل کالج میں شام کی کلاس لیا کرتے تھے اسے اتفاق ہی سمجھا جائے کہ میں نے پہلی بار شاعری میں بحور کی تقطیع کا طریقہ اسی کلاس میں سیکھا تھا جس میں تجرباتی طور پر میں نے شرکت کی تھی اور یہ پہلی اور اخری شرکت ہی ثابت ہوئی تھی، اس طرح اگر میں اپنی اقدار کے مطابق یہ کہوں کہ حسینی شاہد میری شاعری میں ایک بحر کے استاد تھے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ اردو ہال کا حال اتنا اچھا نہ تھا پورے وسیع و عریض ہال میں کہیں ائرکنڈیشن نام کی کوئی چڑیا دکھائی نہ دی، صرف پنکھوں کے زاغ آوازیں کرتے پھڑ پھڑاتے دکھائی اور سنائی دیے۔ رحمٰن جامی جدہ بھی آ چکے تھے اس

لئے تعارف کی ضرورت نہ تھی البتہ رحمت یوسف زئی سے ڈاکٹر روف خیر نے میرا تعارف کروادیا تھا۔ مشاعرے کی نظامت پروفیسر رحمت ہی فرمارہے تھے اور صدارت کی کرسی بلکہ پوری بنچ خالی رکھ کر اس پر مخدوم کی تصویر کا فریم سجادیا گیا تھا اور یہ اعلان ہوا کہ یاد مخدوم کے اس پروگرام میں صدارت مخدوم محی الدین ہی کی تصور کی جاے۔ میرے لئے کم از کم یہ نیا تجربہ تھا کہ زندوں کی صدارت ایک مرحوم فرمارہے تھے، اس طرح مردہ پرستی کا ایک اور نمونہ دیکھنے کو ملا۔ یہاں مشاعرے میں تسنیم جوہر، مونا لیزا اور حنا شہیدی سے بھی ملاقات ہوئی۔ جدہ سعودی عرب کے وہ اشخاص جو وطن واپس لوٹ گئے تھے ان سے بھی اس پروگرام میں ملاقات اتفاقاہی ہوئی۔

جب دہلی سے پٹنہ کے لئے رخت سفر باندھ رہے تھے اسی اثنا میں محترم سعید منتظر کا فون آیا کہ حیدرآباد میں ایک منتظم مشاعرہ ہیں جو بڑے مشاعرے کرواتے ہیں وہ آپ کی آمد کا سن کر آپ کو اپنے مشاعروں میں مہمان خصوصی بنانا چاہتے ہیں، سعید بھائی نے بتایا کہ انہوں نے مسکین صاحب کو میرا فون نمبر بھی عطا کیا ہے، دوسرے دن ہی مسکین صاحب کا فون آیا کہ کب آرہے ہیں حیدرآباد ہم دو مشاعرے کررہے ہیں جس میں آپ مہمان خصوصی ہوں گے ایک مشاعرہ اردو مسکن حیدرآباد میں ہوگا اور دوسرا سدی پیٹ میں۔ میں نے فیس بک پر موصوف کے بارے میں کچھ پڑھا تھا اور کچھ ساتھیوں سے مشورہ بھی ملا کہ ان کے مشاعروں میں شرکت نہ کرنا ہی عزت سادات بچانے کے لئے ضروری ہے، خیر جب تک بھینس پانی میں ہو سینگوں پر دام نہیں لگاے جاسکتے سو میں نے ان کو انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا البتہ صرف حیدرآباد کے مشاعرے کے لئے حامی بھرلی۔ میں حیدرآباد پہنچا تو مسکین صاحب اصرار کے ساتھ مجھ سے ملنے مانصاحب ٹینک پہنچے اور اپنی صفائی میں لمبا اچوڑا بیان دیا کہ جوان کے بارے میں کہا جارہا ہے وہ صحیح نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال میرے چچازاد اور پھوپھی زاد بھائیوں کا بھی اصرار تھا کہ کوئی مشاعرہ ہو انہیں اطلاع دی جاے تاکہ وہ مجھے مشاعرے میں سن سکیں۔ میں نے اپنے کالج کے بعض ساتھیوں کو جو شعر سے دلچسپی رکھتے تھے اور بھائیوں کو اس مشاعرے کی اطلاع دے دی۔

اس مشاعرے میں جارہی رہے تھے کہ محترم نادر مسدوسی صاحب نے اپنے دولت خانے پر محفل شعر کے انعقاد کی اطلاع دی مغل پورے میں واقع ان کا مکان ڈھونڈتے ہوے میں پہنچ گیا اور معذرت کرلی کہ صرف ملاقات کے لئے حاضر ہوا ہوں شعری نشست پھر کبھی یوگ ءتو شرکت ضرور کروں گا۔ میرے وہاں سے رخصت ہونے سے قبل کئی لوگ آچکے تھے جنہیں میرا تعارف بھی کروایا جاچکا تھا سو مسدوسی صاحب نے احباب سے مشورہ کرکے ایک شام میرے نام کے انعقاد کا اعلان بھی کردیا۔

اب میں مسکین صاحب کے مشاعرے کی طرف رواں دواں تھا، موتی گلی خلوت میں نیا آباد کردہ کم از کم میرے لئے تو نیا ہی تھا، کے خواجہ شوق ہال میں مشاعرہ ہوا۔ اے سی لگے ہوے تھے مگر ٹھنڈک کے لئے ان کا چلایا جانا یا چلنا شرط ہوتا ہے سو کچھ دیر کے بعد احساس ہوا کہ کچھ کمی ہے جس کے باعث لوگ گرمی محسوس کررہے ہیں۔ ملک کے دوسرے صوبوں سے بھی شعرا مدعو تھے اور ایک عدد شاعرہ قسم کی لڑکی اسٹیج پر براجمان تھے۔ مقامی شاعرات میں حنا شہیدی بھی مدعو تھیں، مقامی شعرا سامعین کی نشستوں سے ہی آکر اپنا کلام سناتے رہے۔ اس مشاعرے کی یہ خصوصیت بھی تھی کہ یہ داغ دہلوی کی برسی کے سلسلے میں منعقد کیا گیا تھا اور اس اہتمام میں داغ کی قبر کی داغ دوزی اور صفائی کا انتظام بھی کیا گیا، صرف یہی نہیں داغ کا ایک نمونہ جو داغ کی سی (ان کے تئیں) ٹوپی لباس پہنا کر داغ پر ہنسنے کا اچھا انتظام کیا گیا تھا اس شخص کو اسٹیج پر اور وہ بھی میرے برابر میں بٹھایا گیا تھا جسے اختتام پر داغ کی غزل پڑھنی تھی۔ خدا خدا کرکے مشاعرہ ختم ہوا اور ہم حسب توقع میزبان کا انتظار

کئے بغیر جو منظر سے غائب تھے اپنے دوستوں کے ہمراہ رات دوسرے پہر میں بارکس کی طرف چل دئے جہاں کوئی دھابے وغیرہ پوری رات چلتے ہیں ورنہ ایسے وقت شہر میں کوئی ہوٹل قریبی علاقے میں کھلا نہیں تھا۔

حیدرآباد میں جاوید دانش کی آمد کے انتظار میں مختلف اداروں کے زیر اہتمام داستان گوئی کے انعقاد کا اہتمام کرنے کی کوششیں جاری تھیں تسنیم جوہر نے اس سلسلے میں بہت تعاون کیا اور آخر کار پروفیسر بیگ احساس کی صدارت میں یہ پروگرام اردو ہال میں ترتیب دیا گیا۔ زاہد بھی حیدرآباد یونیورسٹی میں جاوید دانش کے ایک پروگرام کی تیاری کر ہی رہے تھے اور برابر رابطے میں تھے انتظامات کے لئے ان کے مشورے بھی کام آے۔ معروف صحافی و ادیب ڈاکٹر جاوید کمال نے ازراہ کرم اردو ہال بک کروایا اور دیگر انتظامات بھی مکمل کر لئے اسٹیج پر داستان گوئی کے لئے مخصوص طرز کی نشست قالین پر دو گاؤتکیوں کی ترتیب کے ساتھ سجادی گئی، اور ایک غیر مرئی قسم کا مائک رکھ دیا گیا تا کہ سامعین کو مخاطب کرتے وقت داستان گو اور سامعین کے درمیاں مائک کی موجودگی کا احساس مخل نہ ہو سکے۔ شہر کے محترم ادیبوں اور شعرا و شاعرات کے علاوہ تجارتی طبقہ سے بھی لوگ شریک تھے۔ شہہ نشین جس پر صدر محفل پروفیسر بیگ احساس، ناظم اجلاس جاوید کمال، ڈاکٹر زاہد کے علاوہ علامہ اعجاز فرخ خاکسار مہتاب قدر اور ساجد صاحب براجمان تھے۔

جاوید کمال نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور داستان گوئی کی تاریخ پر ابتدائی کلمات کے طور پر گفتگو کرتے ہوے داستان گوئی کی ابتدا کو فورٹ ولیم کالج سے جوڑ دیا اسی لمحے پروفیسر بیگ احساس نے میری جانب بہت لاچار و بیزار نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں یہ کیا ہو رہا!! بہر حال ڈاکٹر زاہد الحق نے اپنی تقریر میں داستان گوئی کی صحیح تاریخ بیان کی اور پھر علامہ اعجاز فرخ نے ایسی داستان چھیڑی کہ لوگ ان کے بیان کے سحر میں کھو گئے کافی دیر اعجاز فرخ جو خطابت کے فن میں طاق ہیں اپنی لفظیات سے سامعین کے ہوش اڑاتے رہے۔ آخر میں صدر محفل پروفیسر بیگ احساس نے داستان گوئی پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ پروفیسر حبیب نثار اور پروفیسر بیگ احساس آج دونوں ہی شریک بزم تھے جن سے دہلی کانفرنس میں ملاقات ہو چکی تھی، حبیب نثار نے تو دہلی میں ہی حیدرآباد آمد پر حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی آنے کی دعوت دے دی۔ پروفیسر بیگ احساس غالبا بہت خاموش طبع شخصیت کے حامل ہیں اس کا اندازہ مجھے کئی بار یوں ہوا کہ جب بھی میڈیا یعنی فیس بک اور واٹساپ پر انہیں کوئی پیام لکھا کوئی بات کہی کوئی جواب کبھی نہ آیا اس کی وجوہات پر مجھے کچھ کہنا نہیں ہے کہ مجھ سے ان کا ذاتی طور پر کوئی تعارف یا تعلق کبھی نہ رہا اس کی وجہ ہمیشہ ان کی خاموشی بھی رہی ہوگی بہرحال پروفیسر ہیں ان کی اپنی مصروفیات بھی رہی ہوں گی دہلی میں اسی سبب میں نے ان سے ملاقات پر صرف سلام پر اکتفا کیا۔ آج بیگ صاحب کی صدارت میں دو چار جملے ان سے شاید گفتگو کا موقع ملا تو بہت اچھا لگا۔

جاوید دانش دلھا بن کر آ گئے تو اسٹیج کا ہر حصہ گویا ان کی داستان گوئی کا منتظر تھا سب کی نگاہیں اسٹیج پر جمی تھیں اور جاوید دانش اپنے لکھنوئی لباس میں بانکوں کی طرح پہلو بدل بدل کر ''داستان ہجرتوں کی'' کے موتی بکھیر رہے تھے۔ تقریبا چالیس منٹ پر محیط داستان ختم ہوئی۔ اس پروگرام کی ایک خامی جس کا ذکر بعد میں حبیب نثار نے فرمایا تھا اگر وہ اسی وقت یاد دلا دیتے تو اس کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے، وہ خامی تھی مہمان کو گلدستے پیش کرنے کی یا گلپوشی کرنے کی۔ گیا وقت تو ہاتھ نہیں آتا مگر مجھے بہت قلق رہا، اسی محفل میں جاوید دانش کی قدیم دوست پدما جا آئنگر عرف پیڈی سے بھی ملاقات ہوئی بہت خوش اخلاق خاتون تھیں ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مختلف زبانوں میں شعر ادب کا ایک مرقع ترتیب دیا جس میں جاوید دانش اردو شاعری کا حصہ بنے۔ پیڈی نے مجھے بھی اپنی

آئند اشاعت کے لئے کلام بھیجنے کی خواہش کی۔ دو یا تین دن بعد حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے وسیع وعریض آڈیٹوریم میں جاوید دانش کی داستان گوئی طے تھی۔ حسب وعدہ میں پروگرام سے کچھ دیر قبل ہی پہنچ گیا تھا کہ پروفیسر حبیب نثار نے اپنے تلامذہ سے ایک ملاقات کا انتظام کر رکھا تھا، یہ میرے لئے نیا تجربہ تھا، میں نرا شاعر قسم کا آدمی اور ادھر یونیورسٹی میں تحقیقی میدان کے جواں سال سواروں کا سامنا تھا۔ ڈاکٹر زاہد مجھے ساتھ لے کر اس ہال میں پہنچے جہاں پروفیسر حبیب نثار اور طلبا وطالبات کا گروہ ہمارے منتظر تھے۔ پہلے زاہد نے جم کر میرا تعارف کروایا تو مجھے لگا کہ اچھا خاصا رعب طلبا وطالبات پر پڑھ چکا ہے اب مجھے کچھ کہنے سننے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ پروفیسر حبیب نثار نے بھی کافی محبتوں کا اظہار فرمایا اور خلیج میں میری ادبی خدمات اور نثر ونظم کے ساتھ صحافیانہ تجربے کا ذکر کرتے ہوے کافی ستائش فرمائی، پھر کیا تھا میں تو برج جدہ پر چڑھ بیٹھا (چنے کے جھاڑ پر نہیں)۔ طلبا و طالبات نے گفتگو کا آغاز کیا اور ایک طالب علم نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر میری رائے جاننے کی خواہش کی، مجھے جانے کیوں ان موضوعات سے کبھی دلچسپی نہیں رہی پڑھا سنا تو ہے مگر اس پر گفتگو کرنے کا نہ موقع ملا نہ ضرورت محسوس کی، اب جبکہ یہ دونوں دور گزر چکے ہیں اس ادوار پر ریسرچ کرنے والوں کو تو دلچسپی ہوسکتی ہے مگر مجھ جیسے عام اردو کے طالب علم کو کیا مل سکتا ہے اس لئے عموما میں اس قبیل کے موضوعات سے لاتعلقی کا اظہار کرتا ہوں اور یہاں بھی میں نے یہی کیا اور لڑکوں سے خلیج میں شعر وادب اور ترویج و تشہیر کے حوالے سے سوالات کی خواہش کی۔ گفتگو ہوتی جوابات حسب توفیق وگنجائش دیتا رہا، پروفیس حبیب نثار کی معیت نے بڑا حوصلہ دیا، شاعری بھی سنی گئی لڑکوں اور لڑکیوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا ایسے میں ایک بھلی سی سادہ لوح لڑکی نے مجھے اس پر شعر کہنے کی خواہش کر دی، میں آٹوگراف کے تجربے سے تو گزر چکا تھا مگر کوئی لڑکی اپنے لئے اپنی ذات پر شعر کہنے کی خواہش کا سامنا پہلی بار ہوا۔ بہرحال لڑکی اچھی بھلی شکل وصورت کی تھی اور رنگ بھی گورا چٹا ہی تھا سو میں نے اپنا ایک پرانا شعر (ظاہر ہے کہ لڑکی کو کیا پتہ میں نے شعر اس کے لئے نہیں کہا تھا) ''رخ روشن لب خنداں نگہہ کیف اثر۔۔ایک چہرا ہے مگر چاند کا ٹکڑا سا لگے'' سنا بھی دیا اس کی خواہش کے مطابق ایک پرچے پر لکھ بھی ڈالا۔ اس کے بعد ہم لوگ داستان گوئی سننے کیلئے آڈیٹوریم میں پہنچے، اگلی نشستیں خالی تھیں میں نے ایک نشست سنبھال لی۔ پیچھے سے کسی کے بات کرنے کی آواز آئی میں یہ تو جانتا تھا کہ عقب میں کوئی خاتون تشریف فرما تھیں مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کا نام آرزو مہک ہے۔ آرزو مہک نے کسی سے اپنا نام بتایا تو میں نے پلٹ کر کہا میں مہتاب قدر ہوں، آرزو مہک فیس بک کے دوستوں میں عرصہ دراز سے شامل تھیں سو انہیں بھی بہت خوشی ہوئی کہ آج ملاقات ہوئی اور میں نے بھی مسرت کا اظہار کیا۔ داستان گوئی سے پہلے ڈاکٹر زاہد نے تعارفی تقریر کی اور داستان گوئی کے بعد پرنسپال یا ڈین صاحب نے اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار فرمایا اور جاوید دانش کی صلاحتیوں کو بہت سراہا۔ واپسی میں شام کا کھانا انہی احباب کے ساتھ ہوا، کسی کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے من پسند احباب کے ساتھ کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ پروگرام کے دوسرے دن غالبا جاوید دانش دہلی کولکتہ کے لئے روانہ ہوگئے وہاں سے انہیں پھر کنیڈا بھی لوٹنا تھا۔ سو یہ جاوید دانش سے اس سفر کی آخری ملاقات تھی۔ مسدوسی صاحب دولت کدہ مسدوسی ہال میں میں میرے لئے بہت محبت کے ساتھ نشست کا اہتمام کیا گیا۔ محفل شعر سے پہلے گل پوشی وغیرہ بھی کی گئی پھر میری شاعری اور ذات کے حوالے دو حضرات ایک م ق سلیم صاحب اور دوسرے میرے بزرگ ڈاکٹر اے راہی نے مضامین پڑھے، دونوں مضامین میرے لئے چونکا دینے والے تھے۔ م ق سلیم سینئر صحافی وادیب نے باقاعدہ تحقیقی طرز

کا مضمون پڑھا جس میں میری نثر و نظم کے علاوہ مزاحیہ شاعری کا بھی احاطہ کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر راہی نے میرے قلمی نام کے بجائے اصلی نام کا انکشاف کیا کہ میں انہیں مہتاب قدر کے علاوہ سید سرفراز علی کے نام سے بھی جانتا ہوں پھر موصوف نے چنچل گوڑے میں میرے والد کی قدیم لائبریری اور اس سے استفادے کا ذکر کیا ساتھ ہی میرے والد محترم اور چچا کے ساتھ اپنے گہرے مراسم اور ادبی تحریکات میں ساتھی ہونے کا بھی انکشاف کیا جو میرے لئے بالکل عجوبہ سا تھا۔ بہرحال مشاعرے سے بھی فراغت ہوئی تو ڈاکٹر راہی نے اپنی ایک اور انجمن میں میرے لئے نشست کے اہتمام کا اعلان فرمایا۔ دو چار دن بعد میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر ملاقات کیلئے گیا تو انہوں نے اطلاع دی کہ آپ کا اس وقت مشاعرہ ہے آپ گئے نہیں مشاعرے میں!! مجھے تعجب ہوا کہ اس کڑی دوپہر میں بھی کوئی مشاعرہ ہوسکتا ہے بھلا، اخبار میں شایع شدہ خبر دیکھی تو پتہ چلا کہ اسی وقت مشاعرہ تھا بہرحال میں اس وقت کسی بھی جگہ جانے کے موڈ میں نہیں تھا سو، خاموشی اختیار کرلی۔ میرے جدہ سے نکلنے سے پہلے فیس بک کی ایک اور دوست جمیلہ نشاط نے اپنی سماجی خدمات اور خواتین کے حقوق کے لئے اپنے سنٹر کا ذکر کیا تھا، میں نے اطلاع دی تو وہ خود اپنی جیپ سے ڈرائیور کے ساتھ آگئیں اور مجھے لے کر شاہین سنٹر پہنچیں جو پرانے شہر کے قدیم محلّہ سلطان شاہی میں واقع ہے۔ وہاں کی صورت حال بھی عجیب وغریب تھی بہت ساری چھوٹی بڑی لڑکیاں مختلف قسم کے کام سیکھنے میں مصروف تھیں انہیں مجھ سے گفتگو کے لئے جمع کیا گیا، لڑکیوں نے گفتگو کے ساتھ کورس میں ایک قوالی بھی سنائی جس میں معاشرے کی ناانصافی کے خلاف لڑنے اور مستعدی سے مقابلہ کرنے کی باتیں گئی تھیں۔ جمیلہ نشاط نے بعض لڑکیوں سے ان کے احوال سنوائے جو رونگٹے کھڑے کرنے والے تھے۔ کئی لڑکیوں معاشرے اور رشتہ داروں عزیزوں کے ظلم کا شکار ہوکر شاہین سنٹر میں تربیت پارہی تھیں ایک لڑکی نے بتایا اب انہیں کسی سے کوئی ڈر نہیں لگتا کوئی دادا بھی ہم سے گفتگو نہیں کرسکتا۔ سب سے ڈٹ کر بات کرتی ہیں ساتھ وکیلوں کی خدمات بھی جمیلہ نشاط نے لے رکھی تھی وہ شادی شدہ جوڑوں میں اختلافات طلاق علیحدہ کے معاملات میں کونسلنگ بھی کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ بہت حوصلہ افزا تھا کہ عزت دار بہو بیٹیوں کیلئے کوء آواز اٹھانے والا جو مسلمان بھی ہو میرے سامنے تھا۔ لڑکیوں دکھی حالات کا طبیعت پر بہت بوجھ تھا دوبارہ جمیلہ نشاط نے مجھے اپنے گھر تک پہنچادیا۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا۔۔۔۔۔ اخر کار لوٹ کے بدھو۔۔۔۔۔ جدہ آے اور سفرنامہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین

کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:

زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔۸۲

طنز و مزاح

مشاہیر یا مساکین

منظر علی خاں منظر نے عجب ذہنِ رسا پایا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بینکار ہیں لیکن ایک کھاتہ دنیائے ادب میں بھی کھول رکھا ہے جس میں وہ کتابیں لکھ لکھ کر جمع کراتے ہیں، اور اصل سے کئی گنا زیادہ منافع ادبی شہرت کی صورت میں وصول کرتے رہتے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں میں ان کے کمالات کا اظہار ہوا ہے۔ نثر لکھتے ہیں تو انیسویں صدی کے ''اودھ پنچ'' کے اسلوب میں اور شعر کہتے ہیں تو بیسیوں صدی کے نوح ناردی کے رنگ میں ان جیسے ادیب کم ہوں گے جو پوری دو صدیوں پر حاوی ہوں۔

منظر علی خاں خود ہی نہیں لکھتے بلکہ انھوں نے بے شمار لوگوں کو بھی لکھنے کے کام پر لگا رکھا ہے۔ خود لکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ اس کے لیے صرف کاغذ، قلم اور ارادے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن دوسروں سے لکھوانا بہت مشکل کام ہے اور یہ مشکل اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب موضوع ٹیڑھا ہو۔ منظر صاحب اپنی نصف درجن تصانیف پر ایک سو سے زیادہ لوگوں سے مقدمے، دیباچے، فلیپ کی آرا اور توصیفی خطوط لکھوا چکے ہیں۔ ان لکھنے والوں میں متعدد ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں منظر صاحب ہی کی وجہ سے زندگی میں پہلی اور آخری بار قلم اور کاغذ کے استعمال کا موقع ملا ہے۔

اسی لکھنے لکھانے کے شغل کی بنا پر منظر صاحب کا ذاتی شعبہ تعلقاتِ عامہ خاصا وسیع اور فعال ہے۔ غزلیں اور مضامین لکھنے سے جو وقت بچتا ہے، وہ اسے خط کتابت میں صرف کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ لوگ خط پڑھ کر ضائع کر دیتے ہیں، مگر منظر صاحب نے نہ صرف یہ کہ دوسروں کے خط ضائع نہیں کیے بلکہ اپنے خطوط کی نقلیں بھی سنبھال کر رکھیں۔ جب خطوں کا خاصا ڈھیر جمع ہو گیا تو اسے ٹھکانے لگا دیا یعنی کتابی صورت میں شائع کر دیا۔

کتاب کا نام ''اگر نامہ بر ملے'' سرورق پر نام کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے ''مجموعہ خطوطِ مشاہیر بنام منظر علی خاں، منظر علی خاں بنام مشاہیر'' اگرچہ منظر صاحب نے بر بنائے انکسار اپنے آپ کو مشاہیر میں شامل نہیں کیا لیکن از رہِ کشادہ دلی جن لوگوں کو مشاہیر کی صف میں بٹھایا ہے، ان میں سے اسّی فی صد وہ ہیں جو ''مساکین'' میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ منظر صاحب چوں کہ طنز و مزاح نگار ہیں، اس لیے ممکن ہے انھوں نے لفظ ''مشاہیر'' کو اس کے متضاد معنوں میں استعمال کیا ہو۔ اگر ہمارا خیال درست ہے تو پھر منظر صاحب کو ان کے ''حسن خیال'' کی داد ملنی چاہیے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ انھی بھی مشاہیر کی صف میں بٹھا دیا جائے۔

اس کتاب میں چار سو کے قریب خط ہیں۔ ان میں سے تقریباً آدھے منظر صاحب نے اور باقی آدھے دوسروں نے لکھے ہیں۔ یہ ''دوسرے'' جن کی تعداد اسّی کے قریب ہے وہ لوگ ہیں جنھیں منظر صاحب نے خط کتابت کے لائق سمجھا۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اکیاسی مصنفین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ استاد لاغر مراد آبادی فرماتے ہیں کہ ایسا بے نتیجہ زورِ قلم کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ کم از کم منظر صاحب کے خطوں کے بارے میں یہ بات درست نہیں ہو سکتی۔ اپنے اس کمزور اور موقف پر ہم آگے چل کر زورِ قلم صرف کریں گے۔

اگر اس مجموعے میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر اور زاہدہ حنا کے خطوط شامل نہ ہوتے تو ہم یہ کہتے کہ دوسروں کے خطوط

شائع کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، منظر صاحب صرف اپنے خط شائع کر دیتے تو اچھا تھا۔ آخر غالب کے خطوں کے مجموعوں میں بھی تو صرف انھیں کے خط ہیں۔ کسی دوسرے کا کوئی شامل نہیں کیا گیا۔

غالب کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ کتاب کے مرتب ڈاکٹر قنبر علی خاں کو غالب اور منظر علی خاں کی خطوط نویسی میں بہت سی ''مشترک اقدار'' نظر آئی ہیں۔ شاید انھیں اقدار کی تلاش میں بیحد مصروف رہنے کی وجہ سے وہ کتاب کی ترتیب کی طرف توجہ نہیں کر سکے۔ خطوں کی تاریخی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی۔ جس خط کو جہاں چاہا ٹانک دیا ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ جواب طلب خط سے پہلے اس کا جواب پڑھنے میں آ رہا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوں کے درمیان چند غیر متعلق خطوط بھی شامل کر دیئے ہیں۔ ایک خط تو ایسا ہے کہ اس سے غلط فہمیوں کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے'' آغا صاحب کی ساری فلاسفی دھری کی دھری رہ گئی''۔ یہ خط دراصل بی سی سی آئی کے آغا حسن عابدی کے بارے میں ہے۔ مرتب نے اسے ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوں میں شامل کر دیا، یہ بھی نہ سوچا کہ'' آغا صاحب'' سے مراد کون سے آغا صاحب ہیں۔ جناب مرتب، احمد کی پگڑی محمود کے سر رکھنے کے بھی شائق ہیں۔ منظر صاحب کے ایک خط کو ڈاکٹر انور سدید کا خط بنا دیا ہے، موصوف نے اتنی زحمت بھی نہیں کی کہ بعض مکتوب نگاروں کے بارے میں ایک دو تعارفی سطریں ہی لکھ دیتے تا کہ یہ تو معلوم ہو جاتا کہ ان ''مشاہیر'' کے غیر معروف رہ جانے کی وجہ کیا ہے۔

خیر یہ سب ضمنی باتیں ہیں، اصل بات یہ ہے کہ منظر علی خاں کے خطوں میں جو ادبی چاشنی ملتی ہے، وہ حاصل کتاب ہے۔ ان کے خطوں سے ایک باغ و بہار شخصیت سامنے آتی ہے۔ وہ بغیر کسی سابقہ تعارف کے پہلے ہی خط میں اپنے مکتوب الیہ سے اتنے بے تکلف ہو جاتے ہیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ موقع و محل کی مناسبت سے طنز و مزاح سے بھی کام لیتے ہیں۔ ان کا مزاح مہذب اور شائستہ ہوتا ہے اور طنز ایسا لطیف جن کو ہدف بنایا جائے وہ بھی محظوظ ہوتا ہے کہ وار خالی گیا۔

منظر صاحب اپنے خطوں میں ایک خوش اخلاق اور مخیّر انسان کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ خوش اخلاق وہ اتنے ہیں کہ ہر عید پر لوگوں کو عید کارڈ بھیجتے ہیں۔ شادیوں پر مبارک باد کے اور اموات پر تعزیت کے خط لکھتے ہیں۔ کسی کو کوئی عہدہ یا اعزاز ملے تو اس پر خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں جیسے یہ عہدہ یا اعزاز خود انھیں ملا ہو۔ کوئی بیمار پڑ جائے تو اس کی مزاج پرسی ایسے خلوص سے کرتے ہیں کہ بیمار کا صحت مند ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ ان کے مخیّر ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ ہر خط کے ساتھ اپنی کوئی نہ کوئی تصنیف ضرور بھیجتے ہیں۔ نئے سال کی ڈائریاں تقسیم کرتے ہیں اور بعض خوش قسمت لوگوں کو مٹھائی اور قلم وغیرہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وا دریغا! کہ منظر صاحب نے ہمیں کبھی اس سلوک کے لائق ہی نہیں سمجھا۔ زیرِ نظر کتاب کی بجائے اگر وہ کوئی ڈائری بھیج دیتے تو اچھا تھا۔ ہم کالم لکھنے کی مشقت سے بچ جاتے اور ڈائری میں کوئی ڈھنگ کی چیز لکھتے۔ مثلاً ان لوگوں کے حالات زندگی لکھتے جو ادیب نہ ہونے کے باوجود ادب میں نام پیدا کر لیتے ہیں۔

منظر صاحب کے خطوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مزاح ان کی تحریروں ہی کا خاصہ نہیں، عملی زندگی میں بھی وہ اس سے خوب کام لیتے ہیں۔ اس مجموعے میں رسالوں کے ایڈیٹروں کے بھی بہت سے خط ہیں جن میں سے اکثر میں یہ لکھا ہے کہ آپ جس بینک میں کام کرتے ہیں، اس کا اشتہار دلوایئے۔ ایسے خطوں کے جواب میں منظر صاحب عموماً اپنا کلام بھیج دیتے ہیں۔ ایڈیٹروں

کے ساتھ ایسا مذاق کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اشتہار کی امید میں غزلیں چھاپنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کوئی دل جلا ایڈیٹر غزل کو اشتہار سمجھ کر اس کے چھاپنے کا معاوضہ طلب کر سکتا ہے۔ ویسے یہ کوئی معیوب بات بھی نہیں۔ آج کل یورپ، امریکہ، اور خلیج کی ریاستوں کے اردو ادیبوں کی نگارشات رسالوں میں اشتہارات ہی کی صورت میں شائع ہوتی ہیں۔

مشاہیر کے جو خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں، ان میں سے بیشتر کو اگر خطوط کی بجائے رسائد کہا جائے تو بہتر ہوتا کیوں کہ ان میں ڈائریوں، کتابوں اور عید کارڈوں کی وصولی کی اطلاع دی گئی ہے اور تہ دل سے شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ رسائد کے علاوہ کتاب میں کچھ ٹیلی گرام بھی شامل ہیں۔ یعنی کچھ خط اتنے مختصر ہیں کہ ان پر ٹیلی گرام کا شبہہ ہوتا ہے۔ مثلاً شان الحق حقی کا ایک مکمل خط یہاں نقل کیا جاتا ہے:

محبی۔ تسلیم!

پیش لفظ کتابت کے بعد ایک نظر دکھا دیں تو ممنون ہوں گا۔

مخلص۔ شان الحق حقی

معلوم نہیں منظر صاحب نے شان صاحب کو ممنون کیا یا نہیں، ہم مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے بے حد ممنون ہیں کہ ہمیں ایک ادبی شاہ کار سے استفادہ کا موقع دیا گیا۔

اس مجموعے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل خطوں سے منظر صاحب اور مشاہیر کے درمیان خلوص و محبت کے گہرے رشتے کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض مشاہیر نے اظہار و خلوص کے نئے نئے پیرائے اختیار کیے ہیں۔ مثلاً جوگندر پال لکھتے ہیں ''آپ بے ضرر معلوم ہوتے ہیں'' زاہدہ حنا لکھتی ہیں: ''میں اگر آپ کو بانکے بہاری کہتی ہوں تو کیا غلط کہتی ہوں۔ واقعی بانکے بہاری کی طرح معصوم ہیں آپ''۔

اس کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط خاصی تعداد میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اور بھی بہت سے مطبوعہ خطوط ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ وہ مکتوب نگاری میں ایک خاص انداز رکھتے ہیں۔ ان کے خطوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مکتوب الیہ کے مزاج اور ذہنی سطح کو پیش نظر رکھتے ہوئے خط لکھتے ہیں۔ منظر صاحب کے نام سارے خطوط ہلکے پھلکے موضوعات پر ہیں۔ کہیں کسی علمی مسئلے پر اظہار خیال نہیں کیا گیا، کہیں کوئی ادبی بحث نہیں چھیڑی گئی۔ بس ادھر اُدھر کی دلچسپ باتیں کی ہیں۔ مثلاً ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: ''اگر آپ اپنے مضمون کے نیچے دستخط نہ بھی کریں تو قاری فی الفور پہچان لے گا کہ مضمون منظر علی خان کا لکھا ہوا ہے''۔ اس پر ہمیں استاد اختر انصاری اکبر آبادی مرحوم کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک مرتبہ کی ایک غزل بغیر نام کے رسالہ ''ساقی'' میں چھپ گئی۔ انھوں نے ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی مرحوم سے شکایت کی۔ انھوں نے کہا ''میاں تمھاری غزل تمھارے نام کے بغیر چھپ گئی تو کیا ہوا۔ ہر شخص سمجھ لے گا کہ یہ تمھاری غزل ہے''۔ استاد نے اس کا سبب پوچھا تو شاہد صاحب نے کہا ''تمھارا ہر تیسرا شعر بحر سے خارج ہوتا ہے۔ ایسی غزل تمھارے سوا کون لکھ سکتا''۔

کالم ختم ہوا اور ہم یہ بتانا بھول گئے کہ کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ہے۔ یہ دیباچہ بھی ایک خط کی صورت میں ہے۔ اس میں قمر رئیس فرماتے ہیں کہ منظر صاحب کے خطوط پڑھ کر مولانا حالی اور مولوی عبدالحق کی تحریریں یاد آ جاتی ہیں۔ ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، البتہ قمر رئیس صاحب کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ مولانا حالی اور مولوی عبدالحق ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، ہماری روایت یہ ہے کہ مرحومین کو ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔ (۲۳ر جون ۱۹۹۴ء)

حمید سہروردی

افسانہ

نواب مرزا

ہائے وہ دن کہ میسر تھی ہمیں رات نئی
روز معشوق نیا ، روز ملاقات نئی
(داغؔ)

نواب مرزا خاں نے اپنے سوٹ کیس سے پانچ تہہ شدہ لفافے بڑی لاپرواہی سے نکالے۔ اور ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ لفافے کھولتے ہوئے اُس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ خالی لفافے کو میز پر رکھتے ہوئے۔ اُس نے ان پانچوں لفافوں پر نظر ڈالی۔

پیارے نواب مرزا خاں!

نواب مرزا وہ شام تو تمہیں یاد نہیں ہوگی۔ مگر وہ شام تو ضرور یاد ہے کہ ہم روز یہاں عثمان ساگر کے کنارے آباد کرتے تھے۔ آج بھی جب اس ساگر کے قریب بیٹھی تمھاری بے اعتنائی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ اس ساگر کی لہریں مجھے اپنے ماضی کی طرف لے جاتی ہیں اور میں خود کو چار مینار کے اُس گوشے میں پاتی ہوں۔ جہاں تم نے چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک بات مجھ سے کہی تھی .....آج تمھاری محبت کا چاند نہ جانے کیوں کالے مہیب آسمانوں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔

نواب مرزا تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ گاؤں پہنچتے ہی خطوط کے ذریعے اپنی محبت کی بارش کرواؤ گے اور کچھ دنوں بعد، مجھے اپنا لو گے۔ اب دیکھونا اس ساگر کی لہر، مجھے گولکنڈہ کے اُس ویران گوشے میں لے جارہی ہے۔ جہاں تم نے محبت کے شگوفے میرے دامن میں بکھیرتے ہوئے کہا تھا۔ ''محبت کی کشتی میں اگر تم ساتھ دو، تو اس دنیا کا کوئی سمندر اپنی چنگھاڑتی ہوئی لہروں سے، مجھے ڈرا نہیں سکتا اور میں اپنی چاہت کے چپوؤں سے ایک انجانے جزیرے پر پہنچوں گا۔ جہاں صرف میں اور تم ہوگی۔''

نواب مرزا یاد کرو، وہ لمحات جب میری آنکھوں سے ہر منظر ختم ہو چکا تھا۔ اور ہر جگہ مجھے تمھاری اور اپنی محبت کے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ کہاں تک لکھوں آج مجھے اپنی حالت اُس کشتی میں بیٹھے ہوئے مانجھی کی طرح لگتی ہے۔ جس کے ہاتھوں سے سمندر کی بے رحم لہروں نے چپو چھین لیے اور جگہ جگہ مہیب بھنور اپنے منہ کھولے اُس کشتی کو تک رہے ہیں۔

نواب مرزا کم از کم ایک خط ہی لکھ دو۔ بہت پریشان ہوں۔ میری حالت بالکل اس ساگر کی طرح ہے جو اپنی بے چینی کو لہروں سے ظاہر کر رہا ہے۔ یہاں جلدی آؤ .....اور دیکھو.....میں آج بھی شام کے ساتھ یہاں آتی ہوں.....تمھاری یادوں کو سمیٹے۔

کبھی ہم اس گلی میں نقش دیوار
کبھی اس بزم میں تصویر غم کی
(داغؔ)

صرف تمھاری منیر بیگم عرف منی بائی حجابؔ

نواب مرزا خاں!

برنداون .....شاید اسی نام کے ساتھ ہی ذہن میں وہ لمحات یاد آجائیں گے۔ جن لمحوں میں تم نے چند وعدے اور چند دعوے کیے تھے۔ وعدے تو وعدے ہی بن گئے ہیں تمھاری صورت تو درکنار تم نے گاؤں جا کر ایک خط بھی نہیں لکھا۔ رہے تمھارے وعدے تو اُن میں سے ایک دعویٰ تھا۔

''میں محبت کی سرزمین پر تم سے ملنے کے لیے راہ میں آنے والے صحراؤں میں بھٹکتا وہاں محبت کی نہریں کھودتا، چنار کے درختوں کے پاس محبت کا نغمہ الاپتا، تم تک پہنچوں گا۔''

آج بھی برنداون کی وہ سڑک اس جملے کی بازگشت کو دہرائے گی۔ اگر تم سننا چاہو تو.....نواب مرزا کہیں، تم نے مجھ سے کرشن کی وہ راس لیلا تو نہیں رچائی جب وہ برنداون میں گوپیوں کے سنگت گذرتا تھا۔ اور بے چاری رادھا پنگھٹ پر اُس کا انتظار کرتی تھی۔ میں اب بھی اُس پر تمھارا انتظار کرتی ہوں۔ اور تھک کر گھر واپس لوٹتی ہوں۔ کیا تمھارا دل اس سڑک سے بھی سخت ہو گیا ہے۔ ہائے نواب مرزا تم ایسے تو نہ تھے۔ جلدی سے اپنے وعدے پورے کرو۔ ایک خط ہی لکھ دو.....میری حالت ریگستان میں بھٹکے ہوئے اُس پیاسے مسافر کی طرح ہے۔ جسے ہر جگہ سراب ہی سراب نظر آتا ہے۔

تمھاری ہی صاحب جان

نواب مرزا خاں پیارے!

جس دن تم مجھ سے رخصت ہوئے تھے۔ جب ہی نجانے کیوں مجھے محسوس ہوا تھا کہ یہ لمبی ٹرین میری آرزوؤں کو کاٹتی جائے گی اور حسرتوں کے دھوئیں کے سوا کچھ بھی میرے پاس نہیں رہے گا۔ مگر پھر اس وہم کو محبت کی ایک بنیادی شرط سمجھ کر اپنے آپ پر غصہ آیا تھا کہ تم ایسے بے وفا تو نہیں ہو سکتے۔ مگر.....میرا خیال نہ ہو تو نہ سہی میری امی کی بے نور آنکھوں کو اور بے نور نہ کرو۔ یاد ہے جب تم امی سے میری شادی کا ذکر چھیڑ دیتے تو اُن کی آنکھوں میں کتنی چمک آ جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ پل بھر کے لیے دنیا کا سارا نور اُن کی آنکھوں میں سمٹ آیا ہے۔ روز تمہارے بارے میں پوچھتی ہیں اور میں روز نئے نئے بہانے تراشتی ہوں۔ محض اس لیے کہ کبھی تو تمھیں اپنے وعدوں کا خیال آ جائے گا اور تم اپنی تمام مصروفیت کو چھوڑے۔ یہاں آ کر مجھے اپنا لو گے۔ نواب مرزا، میری چھوٹی ہمشیرہ کے معصوم خیالات کو مجروح نہ کرو۔ اب بھی وہ تمھیں پوچھتی ہے کہ

''دولہا بھائی کب آئیں گے۔'' اب میرے چہرے پر یہ سن کہ بقول تمھاری جسم کا سارا خون سمٹ کر گالوں میں نہیں آ جاتا بلکہ فکر و تردد کی بے شمار لکریں چہرے پر عیاں ہو جاتی ہیں۔ اور میرا جواب نہ پا کر میری ہمشیرہ، میرا منہ تکتی رہے جاتی ہے۔ کہاں تک تمھیں یاد دلاؤں۔ تم بھی تو نہ بھولے ہو گے خدارا جلدی آ جاؤ اور اپنے کہے ہوئے اس شعر کا خیال کرو.....

میرا طریقِ عشق جدا ہے جہان سے
چلتا ہوں چھوڑ چھوڑ کے ہر رہگزر و کو میں

منتظر رحمیدن بائی نقاب

میرے اچھے نواب مرزا

نواب مرزا، بس اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں کہ تنہائی جس میں کسی کی چند حسین یادوں کے ساتھ بھی بے وفائی کا گمان ہوتا ہے۔ بڑی جان لیوا ہوتی ہے۔ ہر چیز عجیب لگتی ہے۔ پہلے جس یونیورسٹی کی اونچی جگہ، شام تمہارے انتظار میں کسی تر و تازہ اور شاداب چہرہ کی طرح نظر آتی تھی۔ اب کسی بیمار کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ کبھی زندگی ایک حسین خواب نظر آتی ہے۔ جس میں تمہاری بے وفائی اور شک کے سانپ مجھے ڈستے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اب بھی تمہاری محبت بھری باتوں کا خیال آتا ہے اور پھر میں سہانے سہانے خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہوں.....ایک خواب .....جب تم نے رات کے اندھیرے میں یونی ورسٹی سے کچھ دور جھیل کے پاس ٹھہرے ہوئے کہا تھا کہ ''عمدہ جان میں یہاں گھر بناؤں گا۔ شہر کے ہنگاموں سے دور .....رات کی تاریکیوں میں ہم اپنی محبت کے دیے جلائیں گے.....اور جھیل کی پر سکون لہریں ہلکے سروں میں ہمارے پیار کو گنگنایا کرے گی۔''

آج بھی وہ گھر کا تصور میرے ذہن میں اُسی طرح محفوظ ہے۔ جب پہلے پہل اس کا احساس ہوا تھا۔ جب میں نے تم سے مذاقاً کہا تھا کہ کہیں یہ خواب تو نہیں کہے جا رہے ہو، تم نے میرے لبوں پر.....اور پھر کہا تھا کہ خواب سے بڑی سچائی کوئی چیز اس دنیا میں ہے؟ انسان مر جاتا ہے تو اس کے خواب ایک دوسری

شکل میں اُبھر آتے ہیں ہاں وہ خواب آج ایک بھیانک اندھیرا لیے اُبھر آئے ہیں۔ اور مجھے ساری دنیا تاریک دکھائی دیتی ہے۔ نواب مرزا میرے خوابوں کو ادھورا مت چھوڑو ..... دیکھو آج بھی میری آنکھوں میں ایک گھر بسا ہوا ہے۔ جواب دو، صرف دو بول ہی.....

تمہاری اپنی عمدہ جان

نواب مرزا میرے

جناب کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ عاشق ہیں۔ اور انداز بالکل معشوقانہ..... یہ آپ کے طور طریقے، ناز و انداز کو استعمال کرنے کا ایک منصوبہ، میں نے بنایا تھا.....مگر جناب نے ہمیں احساس دلایا کہ آپ سے ہی مجھے ناز و انداز سیکھنے پڑیں گے۔ پہلے تو روٹھ جانا، خط نہ لکھنا، آنکھیں چرانا، وعدوں سے مکر جانا، یہاں سے وہاں تک صنفِ لطیف کے انداز ..... ذرا کچھ خیال کرو۔ یہ سچ ہے کہ تم نے کہا تھا کہ تم میرے لیے چاند ستارے توڑ کر لاؤ گے۔ غالباً اس لیے شرمندہ ہو گئے مگر حضور، میں نے کب یقین کر لیا تھا۔ اس لیے دل سے یہ کدورت نکال دیجیے۔ خیر سے وہ جھوٹے ہی سہی۔ کیا محبت کبھی جھوٹ کے بغیر مکمل ہوئی ہے جس محبت میں جھوٹ کا عنصر جس قدر زیادہ ہوگا۔ وہ محبت اتنی ہی جوان ہوگی اور غالباً ہم دونوں ابھی جوان ہیں۔ کم از کم یہ انداز شادی کے بعد اچھے لگتے ہیں۔ آپ جتنا چاہیں جھوٹ بول سکتے ہیں کہ مجھے حد درجہ مصروفیت تھی یا گاؤں میں نہیں تھا۔ کسی عزیز کی مسرت میں اپنے ہوش و حواس گم کر چکا تھا۔ میں سب باتوں کا یقین کر لوں گا۔ جانِ من! محبت میں کیا نہیں ہوتا۔ ایک آپ ہیں ہمارے نہ ہوئے۔ فی الحال.....بعد میں کچے دھاگے۔

خیر مذاق چھوڑیے.....محبت میں مذاق کی باتیں ہو جائیں تو کوئی بات نہیں.....لیکن محبت بجائے خود ایک مذاق نہیں ہے۔ غالباً آپ کو اس بات کا احساس ہوگا۔ میں اپنا ایک ہی غم بیان کرتی ہوں۔ وہ یہ کہ آج کل میرے کانوں میں صرف پوسٹ مین کی گھنٹی ہی سنائی دیتی ہے۔

صرف آپ کی اختر بائی

چھٹیوں کو پڑھنے کے بعد نواب مرزا خاں کا چہرہ ساکت ہو گیا۔ اور اُس نے مشینی انداز سے ایک ہی مضمون کے پانچ چھٹیاں لکھیں

.....

پیاری!

فرض اور محبت کی جنگ میں ہمیشہ فرض کی جیت ہوئی ہے۔ تاریخ کا کلیہ یہی ہے۔ اُمید کہ اپنی تمام محبت اپنے ہی دل میں رکھیے۔ میری شادی میرے والدِ قبلہ نواب شمس الدین خاں کی خواہش پر بہ عمر پندرہ برس میں فاطمہ بنت یوسف حسین خان سے ہو چکی ہے۔ اب میں کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہو سکتا۔

تمہارا نواب مرزا خاں

نواب مرزا خاں نے ان پانچوں چھٹیوں کو منی بائی حجاب، صاحب جان، حمیدن بائی نقاب، عمدہ جان اور اختر بائی کے لفافوں میں بڑی احتیاط کے ساتھ بند کرتا گیا اور ایک اطمینان کا تاثر چہرے پر عیاں ہوتا گیا۔ لفافوں کو بند کر دینے کے بعد اپنی مڑی تڑی سگریٹ کو سلگائے ان پانچوں محبت ناموں کو آگ کی نظر کراتا اور سیٹی بجاتا ہوا لفافہ لیے گھر سے نکل پڑا۔ محبت ناموں کی راکھ کھڑکی کی راہ سے اُس سے بھی تیز فضا میں گردش کر رہی تھی۔

منزل عشق ہے بہ سرائے فانی
رات کی رات ٹھہر جائیں ٹھہرنے والے
(داغؔ)

(شعبۂ اُردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ سمینار بہ عنوان نواب مرزا داغؔ دہلوی: عہد حیات اور فکر و فن کے موقع پر شام افسانہ (داغ کی زندگی سے متعلق بتاریخ 22 ستمبر 2016ء کو پڑھا گیا)

OOO

افسانہ

آثار قیامت

مشتاق احمد وانی

وہ تینوں بڑے شہر کے بڑے رئیس زادے تھے۔اپنے ملک کے سب سے بڑے میڈیکل کالج میں ایم ڈی کررہے تھے۔ان کی طبعیتوں میں ہم آہنگی اور مزاج میں چاشنی نے انھیں ایک دوسرے کے قریب کردیا تھا۔تینوں گہرے دوست بن گئے تھے۔حیرت کی بات تو یہ تھی کہ تینوں اپنے عقیدے کے پابند تھے۔لیکن اس کے باوجود جب وہ آپس میں ملتے تو یوں معلوم ہوتا کہ جیسے وہ آپس میں سگے بھائی ہوں۔ایک کا نام دل محمد ؛دوسرے کا نام چمن لعل اور تیسرے کا نام رنگیل سنگھ تھا۔دل محمد؛دماغ کا؛چمن لعل دل کا اور رنگیل سنگھ معدے کا اسپیشلسٹ بننے کی تربیت حاصل کررہا تھا۔ایک ہی ہوسٹل میں الگ الگ کمروں میں رہتے تھے۔دن بھر وہ کلاس لیکچر اور لیبارٹریوں میں مصروف رہتے لیکن شام ہونے سے پہلے وہ تینوں ہوسٹل سے نکل کے دور تک ٹہلنے چلے جاتے۔وجودیت سے لے کر عالمی منظرنامے تک ان کی گفتگو ان کی دلچسپی ؛معلومات اور ذہانت کو آشکار کرتی۔چہل قدمی کرتے کرتے جب اچانک انھیں مسجد سے اذان؛مندر سے ناقوس اور گرودوارے سے کیرتن کی آواز سنائی دیتی تو وہ تینوں اپنے مالک حقیقی کے حکم کی تعمیل میں لگ جاتے۔تینوں اس بات پہ متفق تھے کہ مذاہب آدمی کو بصارت وبصیرت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آدمی جب صرف دین دھرم کا لبادہ اوڑھتا ہے؛اس کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا تو اس صورت میں آدمی فرقہ پرستی؛تعصب اور نفرت کی دیواریں اتنی اونچی اٹھاتا ہے کہ وہ اپنے آپ میں گم ہوجاتا ہے۔

ایک روز حسب معمول جب وہ تینوں ٹہلنے نکلے تو دل محمد نے چمن لعل اور رنگیل سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

"یارو؛اس دور میں انٹرنیٹ؛موبائل فون اور دوسری الیکٹرانک میڈیا کی چیزوں کے غلط استعمال نے جرائم کے کئی ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔فحاشی؛فیشن بنتی جارہی ہے اور غرور وتکبر؛انانیت اور حسد ؛بغض وعناد جیسی تمام ذہنی خباثتیں دامن انسانیت کو تارتار کررہی ہیں۔میں یہ سب کچھ دیکھ کے تشویش میں پڑ گیا ہوں۔اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

چمن لعل نے جواب دیا

"میرے دوست؛ جو آپ دیکھ رہے ہیں؛میں بھی وہی دیکھ رہا ہوں۔جب میں فیس بک کھولتا ہوں تو لگتا ہے پوری دنیا کے لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر آگے ہیں۔اور سچ سنیں تو مجھے بھی فیس بک؛وٹس ایپ اور انٹرنیٹ چلانے کا ایسا چسکا پڑ چکا ہے کہ بعض اوقات کھانا پینا بھول جاتا ہوں۔یار ایک بے کار سے کام میں پڑ گئے ہیں دنیا والے"

دل محمد نے کہا

"یہ سب چیزیں بے کار اور فضول تو نہیں کہی جاسکتی ہیں البتہ مسلہ ان کے جائز اور ناجائز استعمال کا ہے"

رنگیل سنگھ نے اپنی نیلے رنگ کی پگڑی کی طرف ہاتھ بڑھائے اور اس کا زاویہ درست کرتے ہوئے بولا

" دوستو؛میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ تمام سائنسی وتکنیکی چیزیں مانا کہ آج کے انسان کو بہت آگے لے گئی ہیں۔لیکن مجھے لگتا ہے کہ ان حیرت انگیز چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی آدمی کو میسر نہیں انساں

ہونا۔میں سکون قلب اور امن وآشتی کے ماحول کو سب سے بڑی نعمت خیال کرتا ہوں"

دل محمد اور چمن لعل نے رنگیل سنگھ کے بیان کی تائید کرتے ہوئے کہا

"یار آپ صحیح کہہ رہے ہیں"

دل محمد نے دلیل پیش کی کہا

"جب انسان کو سکون قلب نصیب ہوتا ہے تو اسے گہری نیند آتی ہے۔اور جب دل ودماغ سے سکون رخصت ہوتا ہے تو انسان ساری رات کروٹیں بدلتا رہتا ہے"

چمن لعل بولا

"دراصل لوگ نہ تو مذہبی تعلیم پہ عمل کرتے ہیں اور نہ قانون کا پالن کرتے ہیں۔اسی لیے دنیا میں برائی عام ہورہی ہے۔مذہب کے نام پہ لوگ سیاست کرتے ہیں اور قانون کو جھوٹ بولنے کا ٹیکنیکل طریقہ خیال کرتے ہیں"

دل محمد نے افسردگی سے کہا

"وقت؛ حالات اور اعمال پہ غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔عقلیں مسخ ہورہی ہیں اور شکلیں نکھر رہی ہیں۔ظلم وزیادتی کو مقدر سمجھا جانے لگا ہے اور ہر شخص اپنے آپ کو منوانے کے چکر میں ہے۔محبت اب تجارت بن گئی ہے۔ہم انسانی قدریں کھو گئے ہیں۔اسی لیے پریشان ہیں"

رنگیل سنگھ نے اچانک کہا

"میرا خیال ہے اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔شام ہونے والی ہے"

دل محمد نے کہا" آپ نے بجا فرمایا" ہمیں واپس چلنا چاہیے"

وہ واپس ہوسٹل کی طرف چل پڑے۔دور آگے جانے کے بعد جب وہ ایک پارک سے گزرنے لگے تو تینوں دنگ رہ گئے۔پارک انھیں عیاشی کا اڈہ معلوم ہورہی تھی۔؛اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹی میں پڑھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے علاوہ شادی شدہ مرد عورتیں بھی اس پارک کی رونق بنے ہوئے تھے۔ان کی ناجائز حرکات دیکھ کے دل محمد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا

"یہ سب کیا ہورہا ہے؟"

رنگیل سنگھ نے جواب دیا

"یہ سب موبائل فون اور انٹرنیٹ کے ناجائز استعمال کا نتیجہ ہے"

دل محمد نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگا

"میرے دوست آپ نے بجا فرمایا۔لیکن مجھے ان لوگوں کی یہ ناجائز حرکات دیکھ کے کوفت ہورہی ہے"

چمن لعل نے اپنے ساتھیوں سے استفہامیہ انداز میں پوچھا

" یہ آوارہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شادی کیوں نہیں کرتے؟"

دل محمد نے جواب دیا

"میرے دوست؛ شادی انسان کی مریاداوں کا انت اور ذمہ داریوں کا نام ہے۔یہ ان دونوں باتوں سے گریز کرتے ہیں۔اس لیے یہ وہ کام کررہے ہیں جس کی اجازت نہ تو مذہب دیتا ہے اور نہ قانون۔مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ان عیاش اور آوارہ لڑکوں کے پاس کسی کی ماں؛ بہن؛ بیٹی کو اپنی ماں؛ بہن؛ بیٹی سمجھنے اور دیکھنے والی آنکھیں نہیں ہیں"

رنگیل سنگھ نے کہا

"چلو یار لیٹ ہورہے ہیں"

تینوں ہوسٹل کی طرف چل پڑے۔دل محمد نے کہا

"خدا ان آوارہ لڑکوں اور لڑکیوں کو نیک ہدائت دے۔میں ان کی ناشائستہ حرکات دیکھ کے مایوس ہورہا ہوں"

آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ ہوسٹل پہنچے تو شام ڈھل چکی

تھی۔انھوں نے اپنے اپنے کمروں میں جا کر اپنے اپنے طور پر خدا کو یاد کیا۔رات کا کھانا کھایا اور سو گئے۔دوسرے دن معمول کے مطابق ڈاکٹری پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔وہی پریکٹیکل؛وہی کلاس لیکچر اور لبارٹریوں میں جا کر انسانی اجسام کے پرزوں کے نظام کی جانکاری اوران میں پیدا ہونے والے امراض کے علاج کی واقفیت۔انھیں بہت حد تک دنیا و مافیہا سے دور کر دیتی۔

تین دن کے بعد جب ایک رات رنگیل سنگھ اور چمن لعل؛دل محمد کے کمرے میں آئے تو تینوں کے چہرے ہشاش بشاش تھے۔بیٹھے بیٹھے رنگیل سنگھ نے اپنی پتلون کی جیب سے قیمتی رنگین موبائل سیٹ نکالتے ہوئے کہا

"یار دن کو فرصت نہیں ملتی؛وہٹس ایپ اور فیس بک پہ لوگوں کے میسیج آتے ہیں۔پڑھ نہیں پاتا ہوں۔آپ کی اجازت ہو تو پڑھوں لوں؟"

دل محمد نے کہا

"بڑے شوق سے پڑھ لیجئے"

چمن لعل نے بھی ہنستے ہوئے کہا

"میری جانب سے بھی اجازت ہے"

رنگیل سنگھ نے پہلے تو وہٹس ایپ کے میسیج پڑھے اور پھر فیس بک پہ آیا۔نئے پرانے انسانی چہروں کی کہکشاں اسے یوں نظر آنے لگی کہ جیسے ہر شخص اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔دشت وصحرا؛بحر وبر ؛ حیوانات؛ نباتات اور جمادات کے علاوہ چرندوں؛پرندوں اور درندوں کی کئی تصویریں دیکھتے دیکھتے اچانک اسکے منہ سے چیخ نکل گئی اور ڈر وخوف سے بولا

"ارے یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔یہ چھوٹے چھوٹے بچے؛مرد؛ عورتیں؛بوڑھے؛ جوان لڑکے اور لڑکیاں کلہاڑے اور ٹوکوں سے کاٹے جا رہے ہیں"

دل محمد اور چمن لعل؛رنگیل سنگھ کے بالکل قریب آ گئے اور مارے خوف کے اس سے پوچھنے لگے

"یار---آپ کی چیخ نے ہمیں ڈرا دیا۔آپ کیا دیکھ رہے ہیں اس موبائل میں؛ہمیں بھی دکھائیے"

اس نے موبائل سیٹ ان کے قریب کر دیا۔واقعی برما کی فوج کے سپاہی چھوٹے چھوٹے بچوں؛مردوں؛عورتوں؛بوڑھوں ؛ جوان لڑکوں اور لڑکیوں کو عریاں کر کے کلہاڑوں اور ٹوکوں سے کاٹ رہے تھے۔کچھ لوگوں کو زندہ جلا رہے تھے۔ان مظلوم و بے بس اور بے سہارا انسانوں کی دلدوز اور لرزہ خیز چیخ وپکار سن کر دل محمد کا دل رو اٹھا؛آنکھوں نے آنسو بہانے شروع کیے۔چمن لعل کے وجود میں کپکپی آ گئی اور رنگیل سنگھ نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیئے۔چمن لعل نے ہمت جٹاتے ہوئے کہا

" کہیں ہم یہ سب خیالی تصویریں تو نہیں دیکھ رہے ہیں؟ میرا خیال ہے ایک بار ہمیں پھر انھیں غور سے دیکھنا چاہیئے"

رنگیل سنگھ نے کہا

"ہاں ٹھیک ہے ایک بار پھر دیکھ لیتے ہیں"

اس نے جونہی اپنے موبائل سیٹ پہ انگلی گھمائی تو اس بار ایک اور بھیانک ویڈیو انھیں نظر آئی۔اس میں ایک ندی کے کنارے درجن بھر کتے انسانی لاشوں کو نوچ نوچ کے کھا رہے تھے اور دوسری جگہ ایک کھلے میدان میں سینکڑوں چیلیں اپنے پر تولتی ہوئی مارے ہوئے لوگوں کو کھانے کے لیے جمع ہو رہی تھیں۔یہ بھیانک اور لرزہ خیز منظر دیکھ کے دل محمد؛چمن لعل اور رنگیل سنگھ ایک بار پھر لرز اٹھے۔ان کے دل ودماغ میں غم وغصے اور انتقام کی جوالا مکھی بھڑک اٹھی۔چمن لعل نے کہا

"یہ ویڈیو دیکھ کر میری بھوک پیاس ختم ہو گئی۔میری نفسیاتی دنیا میں بھونچال سا آ گیا ہے۔دل چاہتا ہے اپنی استطاعت کے

مطابق ان بے رحم اور ظالم قسم کے لوگوں سے انتقام لوں"

رنگیل سنگھ بھی بہت زیادہ جذباتی ہو گیا۔ اس نے کہا

"یار میری مانو تو ابھی چل پڑو۔ میرے دوست کا ہیلی کپٹر ہے اس پہ سوار ہو کے اس ملک کے پارلیمنٹ ہاوس پہ اوپر سے ایٹم بم گرا دیں گے تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری"

دل محمد کے دل میں بھی انتقام کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس نے رنگیل سنگھ کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا

"میں یہ سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ ان ظالموں سے انتقام لینا ضروری ہے۔ ہائے کس بے رحمی سے وہ ان چھوٹے چھوٹے بچوں؛ بوڑھوں؛ جوانوں اور عورتوں کو مار رہے تھے"

وہ یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر کانپ گیا۔ پھر ان تینوں نے یہ متفقہ فیصلہ لیا کہ وہ ایم ڈی کی ڈگری کے بجائے ایک نیا راستہ اختیار کریں گے۔ جسے انتقامی راستہ کہتے ہیں۔ دوسرے دن انھوں نے اپنے کالج کے ڈائریکٹر اور والدین کے نام ایک خط لکھا۔ جس میں انھوں نے لکھا کہ

"اب ہم ڈاکٹری کے لائق نہیں رہے ہیں کیونکہ ہماری آنکھوں نے ایک ایسی ویڈیو دیکھی ہے جس میں ایک ملک کے فوجی سپاہی مردوں؛ عورتوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو اس طرح کاٹ رہے تھے کہ جس طرح ہمارے یہاں قصائی گوشت کاٹتا ہے۔ اس لرزہ خیز ویڈیو نے ہماری نفسیاتی دنیا میں ایک ایسا خلفشار پیدا کر دیا ہے کہ ہم ان ظالم لوگوں سے انتقام لینے کے لیے یہ سب کچھ چھوڑ رہے ہیں اور آپ کو بذریعہ ای میل یہ اطلاع دے رہے ہیں"

شام کو وہ تینوں ٹہلنے کے بجائے اپنے مشن پہ نکل گئے تھے۔

OOO

بیگ احساس کے افسانے ''سانسوں کے درمیاں'' میں ایک نئی ٹکنیک استعمال ہوئی ہے جو شعور کی رو کے مشابہ ہے۔ زمانہ حال کی چبھن، فرد کے دماغ پر تناؤ، دباؤ اور ذمہ داری کا بوجھ۔ سب ایک طرح کی ذہنی رو میں بدل جاتے ہیں جس میں مدوجزر (upheval) موجود ہے۔ افسانوی پلاٹ کے ساتھ یہ ٹکنیک ٹریٹمنٹ میں بدل جاتی ہے۔ **مہدی جعفر**

بیگ احساس

کے

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

شاعری

غزلیں

حامدی کاشمیری

مدن لال و جواہر رہ گئے
کالے پانی میں جزائر رہ گئے

کون دے گم گشتہ ساحل کا پتہ
بحر اخضر میں وہ طائر رہ گئے

بے خطر پانی میں اترے تہہ شناس
ساحلوں پر اہل ظاہر رہ گئے

سب عقیدت مند رخصت ہو گئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے

راہب خورشد رو ہے منتظر
کن سیہ راہوں میں زائر رہ گئے

وہ محافل وہ ملاقاتیں کہاں
ملنے کی جگہ مقابر رہ گئے

اپنے سائے سے گریزاں ہم نہ تھے
اس قدر اپنے نگہباں ہم نہ تھے

خاک برسر پا بریدہ کیوں ہوئے
رہبرو صحرائے امکاں ہم نہ تھے

تم نے چہروں پر نقابیں ڈال دیں
دوستو، آئینہ ساماں ہم نہ تھے

کیوں طلب کرتے ہو ہم سے خوں بہا
شامل جشن چراغاں ہم نہ تھے

راستوں کے ماہ و انجم کیا ہوئے
جلوۂ مہر درخشاں ہم نہ تھے

لوگ کیوں محو تماشا ہو گئے
صورت آئینہ حیراں ہم نہ تھے

شاعری

غزلیں

غلام مرتضیٰ راہی

جو تھوڑی بہت مجھ میں خامی رہی
وہ انسان ہونے کی حامی رہی

میں تنہائی میں کب اکیلا رہا
مجھی سے مری ہم کلامی رہی

میاں! دشت کی بات کرتے ہو تم
لبِ جو مری تشنہ کامی رہی

جو گزرے مجھے سانحے دور کے
تو اس کا سبب تیز گامی رہی

حقیقت میں جو ہو مری شخصیت
تصور میں نامی گرامی رہی

جو لاکھوں کا چرچا رہا عارضی
تو دو اک کی شہرت دوامی رہی

خاک اُڑنے لگی ہم گزرے جدھر سے اب کے
کوئی منظر ہی نہیں گزرا نظر سے اب کے

بنتے مٹتے ہوئے ہم دیکھتے کب تک آخر
لکھ دیا نام ترا خون جگر سے اب کے

وہی بارش تھی مگر ریت تھی دریا میں بہت
یوں ہی پانی نہیں گزرا مرے سر سے اب کے

معرکہٗ سخت تھا لیکن مجھے سر کرنا تھا
جان پر کھیل گیا جان کے ڈر سے اب کے

جانے گل کون سا موسم نے کھلایا راہی
شاخیں محروم رہیں برگ و ثمر سے اب کے

غزلیں

شاعری

مصحف اقبال توصیفی

یہ دل، دلِ بے قرار میرا
نہ یار تیرا نہ یار میرا

مجھے لباسِ برہنگی دے
عمامہ سر سے اتار میرا

چلو کبھی ہم نہیں ملیں گے
مگر رہے گا ادھار میرا

وہاں مجھے ڈھونڈتے پھروگے
چڑھے گا ایسا بخار میرا

تو جاؤ کیوں میرے پاس بیٹھو
اگر نہیں اعتبار میرا

عجیب بازار ہے یہ دنیا
دکاں تری کاروبار میرا

حیدر وارثی

نبیؐ کی جب نبوت بولتی ہے
شریعت تب حقیقت بولتی ہے

منزّہ ہوں اگر اطوارِ ہستی
تو پھر نسلِ نجابت بولتی ہے

اگر موجود ہے دل میں محبت
تو یزداں کی عنایت بولتی ہے

اگر معدوم ہے بوئے اخوت
وہی صورت حقارت بولتی ہے

نہیں موجود ہے جس میں دکھاوا
وہ عبدیت صداقت بولتی ہے

اگر بھوکا رہے کوئی کھلا کر
تو پھر شانِ سخاوت بولتی ہے

نہ ہو بیگانہ پن حیدرؔ کبھی بھی
وگرنہ پھر عداوت بولتی ہے

شاعری

غزلیں

علیم صبا نویدی

شکستہ گھر سے سفر پر جو ڈالیاں نکلیں
وہ ساتھ لے کے کھنڈر کی نشانیاں نکلیں

اسی پر لکھی تھی خوش حالیوں کی تحریریں
کسی کے گھر سے جو خالی سی تھالیاں نکلیں

وہ کوئی اور نہیں تھا، ہمارا دل ہی تھا
اسے جو چیر کے دیکھا تو بستیاں نکلیں

جلوسِ فصلِ بہاراں میں پھر سے سج دھج کر
تبسموں کی لبوں پر سواریاں نکلیں

ہماری عمر کی زر خیز سر زمین بھی دیکھ
لہو کے پیڑ سے سر سبز پتیاں نکلیں

زوالِ فن کی سیہ کاریاں مٹانے کو!
صبؔا کے لب سے تھرکتی تجلیاں نکلیں!

شعلہ شعلہ میں دھواں ہونے کو تھا
مجھ سے اک منظر عیاں ہونے کو تھا

آپ نے نفرت سے دیکھا شکریہ
ورنہ اک فتنہ جواں ہونے کو تھا

آسماں نے جھک کے مجھ کو چُن لیا
میں کہاں کب رائگاں ہونے کو تھا

تم نے مجھ کو رد کیا اچھا کیا
حادثہ اک ناگہاں ہونے کو تھا

مہر مہ کیا، بحروبر بھی خوش نہ تھے
میں یہاں جب آسماں ہونے کو تھا

درد کی وسعت سمٹ کر رہ گئی
ضبط میرا بیکراں ہونے کو تھا

وقت کو تھی میری سچائی پسند
جھوٹ کی میں داستاں ہونے کو تھا

شاعری

غزلیں

راشدانوررراشد

یہ جب سنا کہ وہاں ہر کوئی دوانہ ہوا
تو میں بھی شوق سے اس شہر کو روانہ ہوا

قدم سے لپٹے ہیں کن ہجرتوں کے اندیشے
جہاں بھی پہنچا وہاں ختم آب و دانہ ہوا

مری انا کو ہی دنیا نے مسئلہ جانا
مرا ضمیر ہی ہر ایک کا نشانہ ہوا

میں اپنے آپ کو دیکھوں گا اب نئے رخ سے
بھلا ہوا، اسی قاتل سے دوستانہ ہوا

مخالفیں کی سازش تو پھر عروج پہ تھی
مگر وہ فیصلہ حق میں مرے بُرا نہ ہوا

میں اپنی چھوٹی سی دنیا میں اب بہت خوش ہوں
اسے تو دل کے بھلائے بھی اک زمانہ ہوا

حال اپنا بھی ہوا مسندِ شاہی کی طرح
اب کے خوشحالی بھی آئی تو تباہی کی طرح

عمر بھر خون بہانے کا صلہ کچھ نہ ملا
جنگ لڑتے رہے بے نام سپاہی کی طرح

ہم کو مت دیکھ حقارت سے ، تیرے دامن پر
پھیلتے جائیں گے ہم لوگ سیاہی کی طرح

مل چکی ہوتی کڑی دھوپ سے راحت لیکن
ہم نے سوچا ہی نہیں دوسرے راہی کی طرح

سازشی لوگ ہی انعام کے حقدار ہوئے
گفتگو ختم ہوئی رسمی گواہی کی طرح

غزلیں

شاعری

بی ایس جین جوہر

غم سے اپنی تو دوستی ہے
پھر ملاقات روز کی سی ہے
غم پرانا رفیق ہے اپنا
اس سے کچھ بے تکلفی سی ہے
غم بھلا دیا تو یہ ہوا محسوس
زندگی میں کوئی کمی سی ہے
یوں تو خوشیوں سے بھی ہے دید شنید
ان کے ملنے میں بے رخی سی ہے
اس سے رنگ حیات نکھرا ہے
غم سے مل کر ہمیں خوشی سی ہے
غم نہیں ہے تو پھر خوشی کیا ہو
غم میں خوشیوں کی چاشنی سی ہے
عیب اپنے نظر نہیں آتے
دل کے آئینے میں کمی سی ہے
لوگ خوشیاں توبانٹ لیتے ہیں
غم کی دولت ہی کچھ نجی سی ہے
ہاتھ اٹھتے نہیں دعا کے لیے
یہ خودی ہے کہ بے خودی سی ہے
آدمی کو یہ کیا ہنسائے گی
زندگی خود ہی ٹریجڈی سی ہے
یہ غزل ہے کہ نظم بے عنواں
طرز تحریر کچھ نئی سی ہے

رضوان احمد راز

آنکھوں میں مری خواب بسر ہونے لگا ہے
شاہد ترا نیندوں سے گزر ہونے لگا ہے

جُز تیرے سبھی سے مجھے اب ہوتی ہے وحشت
اتنا تری چاہت کا اثر ہونے لگا ہے

یوں دست مسیحائی رکھا زخموں پہ تونے
ہر زخم مرا رشک قمر ہونے لگا ہے

وہ آگ لگائی ہے ترے ہجر نے دل میں
ہر لمحہ جدائی میں شرر ہونے لگا ہے

شاہد مرے کمرے میں بھی اب روشنی آئے
پیدا مری دیوار میں در ہونے لگا ہے

تلخی یہ کہاں کی ترے لہجے میں در آئی؟
ہر لفظ ترا سینہ سپر ہونے لگا ہے

اے رازؔ چھپائے نہیں چھپتی مری وحشت
ظاہر پہ بھی باطن کا اثر ہونے لگا ہے

شاعری

غزلیں

بدر محمدی

لب، حلق، زباں اور نہ تالو کے حوالے
ہر لفظ مرے شعر کا اردو کے حوالے

وہ کھولتا ہے شام ڈھلے اپنی حقیقت
قدرت نے کی ہے روشنی جگنو کے حوالے

شیشے کی طرح عکس نظر ٹوٹ نہ جائے
اک آئینہ خانہ ہے من و تو کے حوالے

ہے مجھ کو خبر دھوپ کی، یوں چھاؤں سے واقف
نظریں ہیں مری عارض و گیسو کے حوالے

حیران نظر آتا نہیں کوئی کسی کو
ہر شخص ہوا جاتا ہے جادو کے حوالے

سکّے کی طرح مجھ کو اچھا لو کہ میں دیکھوں
قسمت ہے مری کون سے پہلو کے حوالے

اسلوب معطر ہے اسے بدؔر میسر
گلہائے ہنر سے جو دے خوشبو کے حوالے

دل اس کی دنیا میں آنکھیں اسی کی دنیا میں
مرا وجود ہے کس بے خودی کی دنیا میں

کسی کی چلتی نہیں ہر کسی کی دنیا میں
کہ کچھ نہ کچھ ہیں سبھی بے بسی کی دنیا میں

زمانہ دیکھتا سنتا ہے ایک مدت سے
تماشا کم نہیں بازی گری کی دنیا میں

چھپانا چاہتے ہیں لوگ ہنس کے غم اپنا
خوشی ضروری نہیں ہے ہنسی کی دنیا میں

ہے کوئی میرا شناسا تو ڈھونڈ لاتا مجھے
میں کھویا رہتا ہوں اک اجنبی کی دنیا میں

یہاں سے دور کہیں وہ نکل گئی ہوگی
ہوا تو رہتی ہے آوارگی کی دنیا میں

گناہ گار ہوں کیسے قریب لاؤں اسے
خدا ہے دور کہیں بندگی کی دنیا میں

نظمیں

حنیف ترین

نظم اسے لکھنے بیٹھی ہے

سبز یادنے اس کی مجھ میں
اک لمبی انگڑائی لی ہے
کاسنی گیتوں کی محفل میں
پھولوں کے روشن رنگوں نے
آ کر پھر دستک سی دی ہے

.....

خوشبو ہر سو مہک رہی ہے
چاندنی شب کا بازو تھامے
صبا کے میخانے میں کھڑی ہے
سحر میں دھوپ کی جوت جلی ہے
کلی ابھی جو پھول بنی ہے
نظم اسے لکھنے بیٹھی ہے!!

پکھراج رُتیں یاد آئیں جب

احساس کے نمکیں سینے میں
دل کے خوش رنگ نگینے میں
اک روپ شوالا پھر اُٹھا
انگڑائیاں لینے لگا موسم
من ہونے لگا رِم جھِم پیہم
نشے کی ہوئی ہر سو چھَم چھَم
ہیں رقص میں خواہش کی گلیاں
پھر تا تک دِھنا دِھن، دِھن کرتی
لذت کی نمو پرور کلیاں
کھلنے کے لیے ہیں بے قابو
بھرتی مجھ میں رنگ و خوشبو

.....

پکھراج رُتوں کی شادابی
جب مجھ میں اڑانیں بھرتی ہے
لمحے صدیاں بن جاتے ہیں
آفاق کو چھو کر آتے ہیں

نظمیں

شاعری

نسیم محمد جان

ایک بچی

ایک بچی پاس میرے آتی تھی
بات کرتی تھی مسکراتی تھی
کتنی میٹھی زبان تھی اس کی
ساتھ لاتی تھی کچھ کھلونوں کو
کھیل کر لوٹ جاتی تھی
بہت معصوم تھی
مگر ایسا ہوا
لاش اس کی ملی پاس کے تالاب سے
سب کچھ کیا ایک شیطان نے
یاد آتی ہے جب مجھے
پاس آ جاتی ہے وہ
کھیلتی ہے نہ مسکراتی ہے
دیکھتی رہتی ہے مجھ کو بت بنی
اور لوٹ جاتی ہے

رندسرشار

جس دن میرا قتل کرو گے
برے جیب سے تم کو ٹکٹ ملیں گے
ٹکٹ سفر کے
امن کی جانب جانے والے
کھیتوں میں لہو بچانے والے
سیدھی راہ بتانے والے
ٹکٹوں کو برباد نہ کرنا

(مراسلہ نگار کے خیالات سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

جو وہ لکھیں گے جواب میں

پروفیسر بیگ احساس صاحب ____ السلام علیکم!

سب رس کے تازہ شمارہ میں ایک مضمون بعنوان ''مابعد جدیدیت نئی فکریات'' اور بنیادی تبدیلیاں، شائع ہوا ہے۔ جس میں بحث کی کافی گنجائش نکلتی ہے۔ مثلاً مابعد جدیدیت مباحث میں آفاقی قدروں کی بجائے مقامی، تہذیبی اور ثقافتی قدروں کے حصول کو ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ تہذیبی اور ثقافتی قدریں کبھی مقامی نہیں ہوسکتیں مرکزیت کے مقابلے تکثیریت، کو راہ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ نظام اخلاق کی فطری ثقافتی قدروں کو دریابرد کر دیا جائے۔ آفاقیت اور مرکزیت کے ختم ہوتے ہی ادب میں کیا باقی رہ جائے گا؟ مابعد جدیدیت کے بنیادی مقاصد کیا ہیں؟ کیا اسے ایک بے ضابطہ تحریک کہنا مناسب ہوگا، اگر نہیں تو کیوں؟ جیکس دریدا نے اپنی تحریروں سے برأت کا اظہار کیوں کیا؟ ہم جنسی، Contract Marriage، Live in Relationship، کے مفروضات مابعد جدیدیت مباحث کا شاخسانہ ہیں جس نے ماں، بہن، بیوی کے محترم رشتوں پر شدید ضرب لگائی ہے، رشتوں کے ختم ہوتے ہی خاندان اور معاشرہ کہاں باقی رہ جائے گا؟ Solo Living کے تحت زندگی گزارنے والے مرد و زن خاندان اور معاشرہ کی تشکیل میں کہیں تک معاون ہوسکتے ہیں؟

راجکماری صاحبہ نے اس بار ''یادیں'' عنوان سے Feminism کو ایک نئے رخ سے متعارف کرایا ہے۔ جس میں سیاسی، سماجی اور ثقافتی خدمات کے علاوہ تعلیمی میدان میں خواتین کی کوششوں کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ حالاں کہ مضمون میں اتنے موضوعات یکجا ہوگئے ہیں کہ ان پر عنوانات قایم کر کے ایک عمدہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ یورپ اور امریکہ سے اٹھنے والی Feminism تحریک میں عملی صداقتوں کا بیان مفقود ہوتا ہے۔ آپ اگر راجکماری صاحبہ سے تانیثیت کے موضوع پر کوئی کتاب لکھوا سکیں تو لوگوں کو یہ احساس ہوگا کہ ہندوستان کی بیدار ذہن خواتین اس جدو جہد میں اس وقت سے شامل ہیں جب کہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی خواتین کو ووٹ دینے کا حق بھی حاصل نہیں تھا۔

ڈاکٹر محمود شیخ۔ جبل پور

برادرم بیگ احساس صاحب ____ سلام و نیاز!

سب رس کا اکتوبر 2017ء کا شمارہ ملا شکریہ!

حالات حاضرہ کا جائزہ لیتے ہوئے روہنی سنگھ رپورٹر دی وائر کی ایک رپورٹ جس نے تہلکہ مچا رکھا ہے پیش کرتے ہوئے روہنی سنگھ کی حق گوئی پر صاد کیا ہے جو حق بہ جانب ہے اس کے ردّعمل میں اس پر فحش الزامات، فون پر دھمکیاں اور اس کے کردار پر کیچڑ اچھالے جانے والی بات کہی ہے جو خاتون ہونے کے ناطے اس اذیت کی اسی طرح سزاوار ہوئیں جس طرح کرناٹک کی گوری گنیش کو مسلسل جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی گئیں اور کلائمکس کے طور پر اس کا قتل عام ہوا۔ موجودہ موزی سرکار میں یہ کوئی نیا ردّعمل نہیں ہے۔ آپ نے کہا کہ جمہوری سسٹم میں بے شمار خرابیاں آ گئی ہیں جب کہ بی جے پی سرکار کا کوئی جمہوری سسٹم ہی دکھائی نہیں دیتا۔ کروڑوں روپے خرچ کر کے عوامی نمائندے منتخب ہونے والے وزراء اور نیتا اپنا سارا پیسہ معہ سود جب تک پوری طرح وصول نہیں کر لیتے تب تک ان سے بے لوث عوامی خدمات کی توقع فضول اور بے جا ہے۔

ملک کی معاشی صورت حال پر بی جے پی کے رہنما کا اظہار تشویش محض نمائش اور جھوٹی تسلی ہے۔ عام آدمی پریشان اور ہراسان ہے، بے روزگاری غربت کی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ صحافتی آزادی کو خطرہ لاحق ہے اور ایسے میں آپ نے امید وابستہ رکھی ہے کہ وزیر آعظم صحافتی آزادی کو بحال فرمائیں گے جب کہ مجھے حق گوئی کی اجازت دی جائے تو میں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا کہ جس خوف کی فضا کو وزیر آعظم کے ذریعہ ختم ہونے کی آپ نے بات کی ہے وہ فضا گجرات میں پوری طرح محیط کرنے کے بعد اب دھلی میں بیٹھ کر اس خوف و تشدد کو پوری طرح Highlight کیا جارہا ہے اور وزیر آعظم خاموشی سے اس خوف اور دہشت کی پشت پناہی کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ ہر دانش ور طبقہ دبے یا ظاہری لفظوں میں بقول مرزا غالب یہ کہنے پر مجبور ہے۔

رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس شمارے میں آپ نے شاعری کو شامل کر کے معتبر شعراء کے کلام سے قارئین کو سرفراز فرمایا ہے جو آپ کے مستحسن اقدام میں روشن اضافہ ہے۔

نصرت جبین کا مضمون ''پروین شاکر کے نسوانی کرب کا تخلیقی اظہار'' قابل مطالعہ ہے۔ بے شک پروین شاکر نے نسوانی کرب و ضبط کا اظہار تقریباً اپنی ایک تہائی غزلوں اور نظموں میں اجاگر کیا ہے جو اپنی جگہ شعر و ادب کی دنیا میں ایک تابندہ مثال ہے حالاں کہ ان کے ہم عصروں میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض کے علاوہ ہندوستانی ادب نسواں میں ترنم ریاض، دارا بانو وفا، ملکہ نسیم، رفیعہ شبنم عابدی، شائستہ یوسف، شہناز نبی، راحت سلطانہ اور نعیمہ پرویز وغیرہم بھی قابل ذکر ہیں۔

مضمون ''ولی دکنی سے بزرگ مالوہ کا ایک شاعر روشن علی روشن'' کے بارے میں حضرت کوثر صدیقی نے ولی دکنی کے ہم عصر ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے جو قابل غور ہے اور یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ ولی دکنی سے پچاس سال قبل ہی انہوں نے اپنا طویل عاشور نامہ ''تصنیف کر دیا تھا جس کو صابر دت مدیر ''فن شخصیت'' نے روشن دلیلوں کے ساتھ روشن علی کا ذکر کیا ہے وہ اس تصنیف کو کہیں عاشور نامہ کہیں جنگ نامہ سے تعبیر کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ وہ کوئی معیاری تصنیف نہیں ہے اس کے باوصف شمالی ہند میں اردو زبان کے ارتقاء کی پہلی دہلیز پر قدم رنجہ ہونے والی ایک طویل نظم قرار دی ہے اور آخر میں موصوف نے مالوہ میں اردو کے ابتدائی ارتقا کو دکن کے برابر شریک رکھا ہے جو برحق ہے۔ مدھیا پردیش میں جہاں حضرت شیخ سعدی دکنی جیسے ریختہ گوؤں کی ریختی منظر عام پر آکر اپنا نمایاں رول ادا کر رہی تھی۔ اسی وقت 1232 تا 1292ھ کے دہوں میں حیدرآباد تا شمالی آرکاٹ تک ریختی کی گونج اپنی علاقائی بولیوں کے ساتھ دکنی ادب کا تاریخی حصہ بن چکی تھی اس دور کے شعراء میں ولی ویلوری شاہ ابوالحسن قربی ویلوری، شاہ تراب ترنا ملی، مولانا باقر آگاہ ویلوری قابل ذکر ہیں اس کے حوالہ جات آپ کو راقم کی ضخیم کتاب ''تاریخ ادب اردو ٹمل ناڈو'' مطبوعہ 2017ء میں نمایاں طور پر پڑھنے کو ملیں گے۔

بحیثیت مجموعی تازہ شمارے کے مضامین بڑے جاندار وقیع ہیں۔ ''سب رس'' تازہ شمارے کے متعلق میں تو بس یہی شعر کہہ کر اپنی بات کو ختم کروں گا۔

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا

بیگم صاحبہ کی رحلت کے بعد بے شمار راتیں رسائل کے مطالعے کی نذر ہو جاتی ہیں۔ سوچیں گویا کتابوں اور رسائل کی خوشبوؤں کی وسعتوں میں سرسبز اور شاداب ہو کر رہ جاتی ہیں اور کبھی کبھار یہ خوشبوئیں یاروں کی دہلیز پر پہنچ کر دستکیں بھی دینے لگتی ہیں۔ ذرا

آپ بھی دیکھئے کہ کہیں آپ کی دہلیز تک شہزادۂ خوشبو کا سلام تو نہیں آیا ہے۔علیم صبا نویدی۔ چینائی

مکرمی!

حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ جو جنوری1938ء سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور تھے۔حیدرآباد دکن کا یہ رسالہ لگ بھگ79 سالوں سے اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے اس کے مدیران میں اکابرین ومشاہرین ادب رہے ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم کے انتقال کے بعد پروفیسر بیگ احساس کو اس کا مدیر بنایا گیا۔ پروفیسر بیگ احساس فکشن رائٹر، افسانہ نگار، محقق، نقاد مانے جاتے ہیں آپ نہ صرف فن کار ہیں بلکہ ایک سماجی سائنس داں اور سیاسی بصیرت رکھنے والے ادیب بھی ہیں آپ کی ادارت میں سب رس 2010ء سے نئے انداز سے شائع ہو رہا ہے۔اس میں مشمولات بھی بصیرت افروز ہوتے ہیں۔ پروفیسر بیگ احساس نے اس کی داخلی و خارجی انداز سے صورت گری میں انقلابی رول ادا کیا ہے۔زیر مطالعہ شمارہ اکتوبر 2017ء کا ہے جو بروقت موصول ہوا پرچہ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد کا ترجمان ہے اس کا جلد نمبر 79 شمارہ10 ہے اس کی مجلس ادارت مجلس مشاورت میں دانش ور ادیب پروفیسر آزمودہ کار صحافی شامل ہیں۔ مدیر نے اداریہ میں دی وائر کی رپورٹ کے انکشافات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور ہندوستان کی جمہوری نظام کی خرابیوں کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ہمارے جمہوری سسٹم میں بے شمار خرابیاں آ گئی ہیں کروڑوں روپے خرچ کر کے عوامی نمائندہ منتخب ہوتے ہیں اور پانچ برس میں وہ اپنا سارا پیسہ مع سود وصول کرنا چاہتے ہیں وہ سرکاری رعایتوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں پارٹی فنڈ کے لیے بڑی بڑی کمپنیوں سے پیسہ لیا جاتا ہے یہ ہے جمہوری نمائندہ بننے کے گُر ان خرابیوں کا تدارک قانون سازی کے ذریعہ ممکن ہے اکثر دیکھا گیا کہ سیاست میں دولت مند لوگ داخل ہوتے ہیں غریب اور شریف قابل لوگ سیاست میں حصہ لینے سے کتراتے ہیں۔ یہ المیہ سے کم نہیں۔کوثر صدیقی کا مضمون ولی دکنی سے بزرگ مالوہ کا ایک شاعر: روشن علی روشن ہے۔مضمون تحقیقی ہے اور اس میں تاریخی دلائل اور سن وعیسوی پر روشنی ڈالتے ہوئے روشن علی روشن کو بزرگ اور اول شاعر بتلایا گیا ہے مضمون نگار لکھتے ہیں کہ ''غور طلب ہے کہ ولی دکنی 1667ء میں پیدا ہوئے۔ جب کہ روشن علی روشن عاشور نامہ 89-1688ء تصنیف کر چکا تھا۔ تاریخی شواہد سے اپنے تحقیقی مضمون میں زور پیدا کیا اور ولی پر ان کی سبقت ظاہر کی ہے روشن علی روشن کے تخلیقی نقوش خان آرزو، مظہر جان جاناں، سعد اللہ سے پہلے منصۂ شہود پر آ چکے تھے۔آج تک بھی ہم ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم مانتے ہیں جامعات میں پڑھایا جا رہا ہے ان کے اس مضمون سے ادبی دانش وروں کو غور کرنے کی ضرورت ہے اور تحقیقی نگاہوں اور کام وعمل سے ہمیں ثابت کرنا ہوگا کہ کون اردو شاعر کا باوا آدم ہے یہ مضمون ادبی مفکروں کے لیے دعوت فکر عطا کرتا ہے۔آمنہ تحسین نے حیدرآباد کی ایک خاتون جو اعلی حوصلہ وعزم والی تھی ان سے متعلق حالات وکوائف کو پیش کیا ہے۔ جمال النساء کا سیاسی نظریہ اور خدمات کے علاوہ ادبی خدمات پر روشنی پڑتی ہے مضمون نیا اور ادبی قارئین کے لیے معلومات کا موجب بنتا ہے۔نصرت جبین نے پروین شاکر کے نسوانی کرب کا تخلیقی اظہار میں شاعرہ کے شعری حوالوں سے مفصل روشنی ڈالی ہے پروین شاکر نے نسوانی کرب کو موثر اور والہانہ انداز سے پیش کیا ہے یہ کرب آپ بیتی و جگ بیتی کا لطف دیتا ہے منظوم حصہ اور نثری حصہ بہت خوب ہے میں مدیر پروفیسر بیگ احساس کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ کی

مدیرانہ بصیرت کی وجہ سے سب رس کا ہر شمارہ ایک ادبی و تحقیقی و تنقیدی دستاویز سے کم نہیں آپ کو اور آپ کے رفقا کار کو صمیم دل سے مبارک باد دیتا ہوں ایک تجویز یہ کہ ادارہ ادبیات اردو میں ماضی میں جو سمینار، کانفرنس، مذاکرہ ادبی نوعیت کے ہوا کرتے تھے آپ کے دور میں ان ادبی سرگرمیوں کو شروع کریں تو ادبی سامعین وقارئین کو فیض پہنچے گا۔ڈاکٹر محمد ناظم علی۔نظام آباد

مکرمی!

مضمون 'وہ کاغذ کی کشتی.....' مشمولہ 'سب رس' نومبر 2017 کے بارے میں چینئی سے محبوب پاشا اعظمی صاحب نے میرے ایک سہو کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس میں متذکرہ ابراہام لنکن سے منسوب قصے کا تعلق دراصل جارج واشنگٹن سے ہے اور وہ قصہ انھوں نے dignity of labour کے نام سے پڑھا تھا۔انھوں نے بلکل بجا فرمایا۔دراصل آج اپنے عہدِ طفلی کی لکھی ہوئی یا پڑھی ہوئی کوئی کہانی میرے پاس موجود نہیں ہے۔ میں نے وہ مضمون اپنی یادوں کو کھنگال کر لکھا تھا۔حسنِ اتفاق سے اس دور کے آس پاس محبوب پاشا صاحب بھی بمبئی میں ہوا کرتے تھے۔انھوں نے اپنی ٹیلی فونی گفتگو میں اپنی یادوں کو یوں بانٹا ہے کہ 'وزیر ہوٹل' کی بجائے انھوں نے وہاں 'وزیر ریسٹورنٹ' کا بورڈ دیکھا تھا اور اس کے مقابل 'کافِ نظاری' اور اسی نام کا بک ڈپو بھی ہوا کرتا تھا۔ان کی یادداشت واقعی غضب کی ہے۔دراصل اس لبِ سڑک وشال مخروطی عمارت کا نام آج بھی 'وزیر بلڈنگ' ہی ہے۔اس کا طعام خانہ ضرور 'وزیر ریسٹورنٹ' کہلاتا تھا، پر اوپری منزل کا رہایشی زون جو کبھی اُس کی 'ریسٹوراں' کے ساتھ ساتھ 'ہوٹل' کی تعریف بھی پوری کِیا کرتا تھا، بعد میں چند الگ الگ گیسٹ ہاؤسوں میں بنٹ گیا۔'کافِ نظاری' آج بھی اسی طرح قائم ہے۔اس سے جُڑا ہوا بُک اسٹال تو نہیں البتہ نیوز پیپر اسٹال ہوا کرتا تھا، جو اب نہیں رہا۔بہر کیف مجھے خوشی ہے کہ میری تحریروں کو اہلِ نظر توجہ سے پڑھتے ہیں۔اسیم کاویانی۔ممبئی

مدیر اعلیٰ ـــــ ماہنامہ سب رس

محترم جناب بیگ احساس صاحب!

میں آپ کا بہت زیادہ ممنون ہوں کہ گزشتہ شمارے میں میرا مضمون بعنوان ''نسائی شعور کی عکاسی: سلمیٰ صدیقی'' شائع فرما کر آپ نے میری حوصلہ افزائی کی۔میں پانچ برسوں سے اس رسالے کا خریدار ہوں۔مجھے یہ کہنے میں بڑا فخر محسوس ہوتا ہے کہ یہ رسالہ خالص ادبی ہونے کے ساتھ کھلے انداز میں قارئین کی آراء کو بھی شائع کرتا ہے۔

پونے میں فیض احمد فیض پر ہورہے سمینار میں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ہمارے کالج میں طلبا کی ایک بڑی تعداد اردو ادب پڑھتی ہے اور لائبریری سے کتابوں کا مطالعہ بھی ان کے شوق کا حصہ ہے۔لہٰذا آپس سے گذارش ہے کہ اگر آپ اپنا افسانوں کا نیا مجموعہ ''دخمہ'' ہماری کالج کی لائبریری کے لیے بطور تحفہ عنایت کریں تو بڑی نوازش ہوگی۔اظہر ابرار۔ناگپور

محترم بیگ احساس صاحب ـــــ السلام علیکم!

'سب رس' ہر ماہ پابندی سے مل رہا ہے۔مشمولات سے فیض یاب ہو رہا ہوں۔عصری تہذیبی، سیاسی، سماجی زندگی کے متعلق آپ کے اداریوں سے روشنی مل رہی ہے بھائی آپ کچھ بھی لکھیں میری فکر کو توانائی ملتی ہے اور میں وہ توانائی اپنے ماحول میں بانٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔اپنے فکشن کی طرح آپ ''سب رس'' کے ذریعہ ایک معیار قایم کیے ہوئے ہیں۔یہ میں نہیں میرا قلم کہہ رہا

ہے (خط لکھنے سے پہلے میں نے سوچا بھی نہں تھا کہ کیا لکھنا ہے)

خیر اب مطلب کی بات پر آتا ہوں۔ اصل میں لکھنے کے سلسلے میں ان دنوں میرے ہاں نظموں کی رو چل رہی ہے، ایسا میرے ساتھ اکثر ہوتا ہے کہ افسانے لکھتا ہوں تو ایک عرصے تک افسانے لکھتا ہوں، غزلوں کا بھی یہی حال ہے۔ پھر ان تخلیقات کو فائیل میں بند کر دیتا ہوں، وقتاً فوقتاً نظر ثانی کرتا رہتا ہوں اور کچھ رد و قبول کے بعد اشاعت کے لیے بھیجتا ہوں۔ ہاں بات ہو رہی تھی۔ نظموں کی (تخلیقی) رو کی تو بھائی میں نے کچھ نظمیں فائل کی ہیں۔ ان میں سے کچھ نظمیں بھیج رہا ہوں۔ **رفیق جعفر۔ پونہ**

میرے کرم فرما! میرے محترم!

پروفیسر بیگ احساس صاحب ____ سلام مسنون!

خدا آپ کو تا دیر سلامت رکھے---- آمین ثم آمین!

اردو دانی، میں اب دل والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں، کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور پروفیسر مغنی تبسمؔ کے انتقال کے بعد ان کی ادبی اولاد یعنی ماہنامہ سب رس کو آپ نے گود لے لیا اور کئی برسوں سے پورے ادبی وقار و معیار کے ساتھ اسے پال بھی رہے ہیں۔ اور یہ حوصلے کا کام صرف دل والوں کے بس کا ہی روگ ہے۔

ورنہ اردو ادب کے اس نادار موسم میں لوگ اپنے پرکھوں کی ادبی وراثتوں کو بھی سنبھال نہیں پا رہے ہیں۔ اور کاروباری ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ معصوم بھی کیا کریں، رسالہ کوئی باتوں سے تو چھپتا نہیں ہے۔ اشتہار کوئی ملتا نہیں ہے۔ خریدار قاری کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ اور اردو زبان کے صاحب لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ اس دور کا تخلیقی ادب ان کے خود ساختہ معیار تک سفر ہی نہیں کر پاتا ہے۔ لیکن اپنے بستہ بردار تخلیق کاروں کی دل جوئی کرنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے ہیں اور ان کے بستہ بردار عقل سے کورے ہونے کی بناء پر یا اپنے آقاؤں کی پیدا کردہ خوش فہمیوں کی بناء پر ادبی محفلوں میں اتراتے پھرتے ہیں، اور ادب کے ہر موضوع پر گفتگو کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

اب ایسی صورت میں ہم ایسے بے دست و پا قلم کار بار بار آپ کے در پر دستک نہ دیں تو کہاں جائیں۔ **شارق عدیل**

OOO

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200 روپے

-/800 طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

عبدالصمد کو عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ

ممتاز فکشن نگار عبدالصمد کو 2017ء کے عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ (دوحہ قطر) سے نوازا گیا ہے۔ انہیں ایک نہایت پُر وقار تقریب میں جو دوحہ قطر میں منعقد ہوئی 2/نومبر 2017ء کی شام یہ ایوارڈ عطا کیا گیا۔ یہ ایوارڈ انہیں مجلس فروغ اردو ادب قطر کے روح رواں جناب محمد عتیق، مجلس کے عہدہ داران، قطر کے اعلیٰ حکام نیز ہندوستان اور پاکستان کے سفیروں کی موجودگی میں دیا گیا۔ ایوارڈ میں ڈیڑھ لاکھ روپے اور سونے کا ایک تمغہ دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر ایک عالمی مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس کی صدارت پاکستان کے ممتاز شاعر اور دانشور پروفیسر خورشید رضوی نے فرمائی۔ اس مشاعرے میں ہند و پاک کے علاوہ امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور قطر کے ممتاز شعرا نے شرکت فرمائی۔ اس سے پہلے 1/نومبر 2017ء ہوٹل میراوٹ، دوحہ میں ایک جلسہ استقبالیہ کا اہتمام ہوا۔ واضح رہے کہ یہ ایوارڈ ہر سال مجموعی خدمات کے لیے ایک ہندوستانی اور ایک پاکستانی ادیب کو مرحمت کیا جاتا ہے۔ اس سال یہ ایوارڈ پاکستان کے مشہور و ممتاز ناقد اور دانشور فتح محمد ملک کو دیا گیا۔ ممتاز فکشن نگار مستنصر حسین تارڑ نے اس ایوارڈ کو اردو کے نوبل ایوارڈ سے تعبیر کیا تھا۔ عبدالصمد سے پہلے یعنی 2016ء میں یہ ایوارڈ جناب جاوید اختر کو دیا گیا تھا۔

عبدالصمد دس ناولوں اور چھ افسانوی مجموعوں کے خالق ہیں۔ ایک خاکے کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ دو تصانیف علم سیاسیات سے بھی متعلق ہیں جو عبدالصمد کا مضمون ہے۔ ان کے کئی ناول اور افسانے انگریزی اور دوسری زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ یافتہ ان کا مشہور ناول ''دو گز زمین'' انگریزی اور ہندی کے علاوہ ہندوستان کی متعدد زبانوں میں چھپ چکا ہے۔

عبدالصمد کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، بھارتیہ بھاشا پریشد ایوارڈ، غالب ایوارڈ، بہار اردو اکادمی کی جانب سے مجموعی خدمات کے لیے ایوارڈ اور دوسرے کئی اوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔ عبدالصمد ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی معروف ہیں۔ وہ سیاسیات کے پروفیسر ہونے کے علاوہ آر این کالج، حاجی پور اور اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی کے پرنسپل بھی رہے ہیں۔ مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا اور بہار یونیورسٹی، مظفر پور کی سینٹ اور سینڈیکیٹ سے کافی عرصہ تک وابستہ رہے۔ وہ کئی تعلیمی اور ادبی اداروں سے منسلک ہیں۔ وہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر (1997-1992ء) بھی رہے۔ تقریباً آٹھ برسوں تک اردو مشاورتی کمیٹی، بہار کے چیرمین بھی رہے ہیں، جو ایک منسٹر کے برابر کا عہدہ ہوتا ہے۔ عبدالصمد انڈھوس (راجگیر) کے باشندہ ہیں اور اب ان کا پٹنہ میں مستقل قیام ہے۔ ان کی پیدائش 18/جولائی 1952 میں بہار شریف (نالندہ) میں ہوئی۔

ایوارڈ یافتہ ادیبوں کو جناب صبیح بخاری نے استقبالیہ دیا۔ اس موقع پر بائیں سے دوسرے جناب محمد عتیق، ہندوستانی سفیر برائے قطر، جناب پی کے کمارن، جناب عبدالصمد، جناب فتح محمد ملک (پاکستان)، جناب صبیح بخاری (میزبان)، جناب خورشید رضوی (پاکستان) اور دوسرے معزز مہمان

ترنم ریاض کا افسانہ 'ساحلوں کے اُس پار' بے حد پسند کیا گیا

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'اسمتا' پروگرام میں خواتین تخلیق کاروں کی شرکت

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'اسمتا' پروگرام کے تحت مدعو خواتین قلم کاروں کی ایک محفل آج رویندر بھون، منڈی ہاؤس کے کانفرنس ہال میں ممتاز افسانہ نگار و شاعرہ ڈاکٹر ترنم ریاض کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس محفل میں سب سے پہلے ساہتیہ اکادمی اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال نے سبھی خواتین تخلیق کاروں کا تفصیل سے تعارف پیش کیا اور 'اسمتا' پروگرام کی اہمیت اور اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد معروف قلم کار اور صحافی ڈاکٹر شہلا نواب نے اردو کی عظیم مصنفہ قرۃ العین حیدر پر ساہتیہ اکادمی کی شائع کردہ کتاب کا تجزیہ پیش کیا اور اُن کے فن و شخصیت کے مختلف گوشوں کو نہایت فکر انگیز اور پُر اثر انداز میں اجاگر کیا۔

'اسمتا' پروگرام کی دوسری قلم کار اردو کی شاعرہ اور صحافی ڈاکٹر وسیم راشد نے اپنا کلام پیش کیا۔ اُن کی کئی غزلوں کو سامعین نے نہ صرف پسند کیا بلکہ بھرپور داد دی۔ اُن کے اس شعر کو سامعین نے بے حد پسند کیا:

میں اس سے دور بھی جاؤں تو کس طرح جاؤں
وہ عطر بن کے میرے پیرہن میں رہتا ہے

محفل کی صدر اور عہد حاضر کی ممتاز فکشن نگار، شاعرہ اور تنقید نگار ڈاکٹر ترنم ریاض نے اپنا افسانہ 'ساحلوں کے اُس پار' پڑھا جسے سامعین نے بے حد پسند کیا۔ یہ افسانہ اُن کے بہترین افسانوں میں سے ایک تھا جو مابعد جدید افسانوی ادب کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی محفل اختتام پذیر ہوئی۔ اس پروگرام میں کثیر تعداد میں اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے کئی حضرات شریک تھے جن میں اشفاق احمد عارفی، فاروق انجینئر، صحافی شہنواز، اقبال فردوسی، محمد موسیٰ رضا، فرزانہ شمسی، شیام سندر، فیصل ذکی، انصاری اطہر حسین وغیرہ شامل تھے۔

Shalimar - SRINAGAR.

جناب غلام مرتضیٰ راہی
Rahi Manzil, Pani - Fatehpur (U.P.) 212 601

جناب علیم صبا نویدی
266, Triplicane High Road, 2nd Floor, Flat No. 16, Rice Mandi Street, Chennai - 600 005

جناب راشد انور راشد
Associate Professor,
Dept of Urdu, Aligarh Muslim University,
Aligarh - 202 002

جناب بی۔ایس۔جین جوہر
Portapur, Delhi Road, Meerut - 250 103

جناب رضوان احمد راز
135, Pani, Fatehpur, U.P. 212 601.

جناب رند سرشار
9-4-77/A/25, Al Hasnath Colony, Tolichowki
Hyderabad - 500 008.

جناب بدر محمدی
Chandpur, Fatah, P.O. Bariarpur, Vaishali 843 102

جناب نسیم محمد جان
Marifat Book Emporium, Sabzi Bagh, Patna -4.

جناب مصحف اقبال توصیفی
Flat 101, Golden Crest Apartment, 12-2-823/B/5,
I.T. Colony, Mehdipatnam - 500 028

جناب حیدر وارثی
Jadeed Warsi Haveli,Taleem Nagar,
Bibi Pakar, Darbhanga - Uttar Pradesh

ڈاکٹر سید تقی عابدی
CANADA.

جناب محمد شاہد
C III Sabah Apartment
Ansar Bagh (Saheb Bagh)
Anoop Shaher Road Aligarh 202002

ڈاکٹر تنویر حسن
C/O Ab. Rashid Mirza, D.C Colony Ward No. 3,
Near PMGSY Office Rajouri. District Rajouri.
State J&K, Pin Code 185131

ڈاکٹر وسیم بیگم
Associate Professor, Dept of Urdu
MANUU, Gachibowli, Hyderabad - 500 032.

محترمہ فرحانہ انجم
Research Scholar,
Dr. Baba Saheb Ambedkar Marathwada
University Aurangabad (Maharashtra)

جناب مہتاب قدر
General Secretary, Gulf Urdu Council
President Urdu Gulbun, Jeddah

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی.
Asst. Prof. Department of Urdu,
Baba Ghulam Shah Badhshah University,
Rajouri, Jammu & Kashmir

جناب حمید سہروردی
Saiban Zubair Colony, Hagarga Cross,
Gulbarga 585 104

پروفیسر حامدی کاشمیری
Masood Manzil, Koh-e-Sabz,

Her Highness Princess Esra Jah with her children R-L Princess Sakira Jah to Son Prince Azmath Jah

Regd No. H-HD 970-2015-2017 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-12 December, 2017 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taanaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (A.P.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469